قاتل خاکہ
اشتیاق احمد
محمود' فاروق' فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیریز

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید

171

ناشر : طاہر ایس ملک
تزئین : محمد سعید نامدار
سرورق : انداز

اس ناول کے تمام واقعات، مقامات اور کردار فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مشابہت یا مطابقت محض اتفاقی امر ہوگی جس کے لیے مصنف یا پبلشر ذمہ دار نہ ہوں گے؛

طاہر ایس ملک
نے (صفدر علی) للہ عبدالرشید پرنٹرز، لاہور
سے چھپوا کر
انداز پبلی کیشنز (مطبوعات اشتیاق)، لاہور
سے شائع کیا۔

قیمت : /● روپے

مطبوعاتِ اشتیاق
۹/۱۲ نصیر آباد مسلم پورہ، سانده کلاں لاہور
فون : ۷۲۲۶۳۵۶ -- ۷۱۱۲۹۶۹ -

انداز پبلی کیشنز
سیکنڈ فلور میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ
اردو بازار۔ لاہور -

حدیث شریف

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تو کسی کو یہ کہتے سنے کہ لوگ تباہ ہو گئے تو وہ سب سے زیادہ تباہ ہے —
یعنی : جو مسلمانوں کی برائی کرے اور خود کو اچھا سمجھے، وہ خود سب سے برا ہے —

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ

- یہ وقت نماز کا تو نہیں ــــ
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا ــــ
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں ــــ
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا ــــ
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص:

اشتیاق احمد

دو باتیں

السلامُ علیکم!

آفتاب احمد کے ایک ناول کی دو باتیں رضیہ بٹ صاحبہ کے بارے میں تھیں، میں نے جب وہ دو باتیں پڑھیں تو میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے بھی اپنا فرض جانا کہ ایک عدد خط انہیں لکھوں۔

اسلام دشمن لٹریچر جب غیر مسلم شائع کریں تو ہمیں ذرا حیرت نہیں ہونی چاہیے ــ کہ ان کا تو کام ہی ہے۔ لیکن جب کوئی ایسا شخص یہ کام کرے جس نے لیبل بھی مسلمان کا لگایا ہو تو حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ پورے ملک میں جانی پہچانی مصنفہ کے اندر اسلام کے خلاف زہر بھرا ہو گا، یہ تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا

تھا۔

میں اپنے تمام قارئین سے یہی درخواست کروں گا کہ اسلام دشمن لٹریچر جہاں کہیں بھی نظر آئے، اس کا فوراً نوٹس لیں۔ مجھے بھی اطلاع دیں اور اپنے علماء کرام کو بھی۔ ان دو باتوں سے میں بھی اس مہم میں شرکت کا ثواب حاصل کر رہا ہوں۔

ناشتا اداس ہے

اخبار کی شہ سرخی پڑھ کر وہ دھک سے رہ گئے۔ ان کی آنکھیں ابلنے کی حد تک باہر کو نکل آئیں۔ سانس لینا بھول گئے، لیکن پھر فوراً ہی خیال آیا، اگر سانس لینا یاد نہ رہا تو پھر اس معاملے پر بات کیسے کر سکتے ہیں، وہ ناشتا کرنے بیٹھے تھے کہ خبر پر نظر پڑ گئی۔ اب ناشتے بے چارے کو کون پوچھتا، رکھا کا رکھا رہ گیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"پتا نہیں کیسے ہو سکتا ہے، لیکن ہو گیا ہے۔" محمود بولا۔

"شاید یہ اس صدی کا سب سے ہولناک واقعہ ہے۔" فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

"جس بات پر غور کرنا چاہیے۔ تم اس پر توجہ نہیں دے رہے۔" انسپکٹر جمشید فکر مندانہ لہجے میں بولے۔

"شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اب کیا کیا جائے۔" محمود

فوراً بولا۔

"ہاں! اگرچہ ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں، ہمیں کوئی گھسیٹے گا بھی نہیں، لیکن اس کے باوجود میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنا پسند نہیں کروں گا۔ لہٰذا سب سے پہلے تمھارے انکل خان رحمان کو فون کرتا ہوں۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"لیکن ابّا جان! وہ بھلا اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں۔"

"کر تو ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہیں سکتا، لیکن ہم ہاتھ پیر ضرور ہلائیں گے۔ بلکہ میں تو پروفیسر صاحب کو بھی فون کر رہا ہوں۔"

"یہ اور بھی اچھا رہے گا، ذرا رونق رہے گی۔" فاروق مسکرایا۔

"ذرا نہیں۔ کافی رونق۔" فرزانہ بولی۔

"شہر میں تو کئی سو گھروں میں قیامت بپا ہو گی۔" محمود اداس لہجے میں بولا۔

"ظاہر ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اُچکائے، پھر فون پر جم گئے۔ بیگم جمشید بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے خبر پڑھ رہی تھیں، ان کے ذہن سے بھی ناشتے کا خیال تک نکل گیا تھا۔

اور پھر خان رحمان اور پروفیسر داؤد ایک ساتھ پہنچے، لیکن ان کے چہرے بھی اُترے ہوئے تھے۔

"ہم جانتے ہیں جمشید۔ تم نے ہمیں یہ خبر پڑھنے کے بعد بُلایا ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ مَیں سوچ رہا ہوں، ہمیں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک۔ ہم تیار ہیں۔" خان رحمان بولے۔

"اور یہ۔ ناشتا کیوں اداس ہے۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"ہمیں اداس دیکھ کر۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"نہیں بھئی۔ مَیں اس بات کا قائل نہیں۔ ہمیں ناشتا کرنا ہو گا، کرنا چاہیے۔ ورنہ ہم حالات کا مقابلہ ڈٹ کر نہیں کر سکیں گے۔" انھوں نے پُرزور لہجے میں کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"ہم نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا۔ تمھارا فون ملا تو فوراً چلے آئے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ٹھیک ہے۔ آیئے پہلے ناشتے سے انصاف کریں۔"

وہ ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی:

"یہ فون خیر کا نہیں ہے۔" فاروق نے اعلان کیا۔

"یار چپ رہو۔ پہلے تھوڑی خوف ناک خبر پڑھ چکے ہیں کہ فون بھی خیر کا نہیں ہو گا۔" محمود بھنّا اُٹھا۔

"دیکھ لینا۔" وُہ بولا۔

"اچھا۔ دیکھ لیں گے۔ دیکھ لینے کے لیے یہاں ہل نہیں جوتنا پڑیں گے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"تم دونوں میرے خلاف خار تو نہیں کھائے بیٹھے۔" فارُوق نے انھیں گھورا۔

"نہیں! ابھی تمھارے سامنے ناشتا کیا ہے۔" محمود مسکرایا۔

ادھر انسپکٹر جمشید ریسیور اُٹھا چکے تھے:

"ہیلو! انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔"

"چلے آؤ بھئی۔" دُوسری طرف سے کہا گیا۔ اور ریسیور رکھنے کی آواز سُنائی دی۔ انھوں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور ان کی طرف دیکھا۔ وُہ بھی انھی کی طرف متوجہ تھے:

"صدر صاحب تھے۔ بُلایا ہے۔"

"اور اسی سلسلے میں بلایا ہو گا۔" فارُوق بولا۔

"اس میں کیا شک ہے۔"

وُہ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ خان رحمان اور پروفیسر داؤد بھی ساتھ تھے۔ ایوانِ صدر میں اداس انداز میں ان کا استقبال کیا گیا۔ وہاں قریباً سبھی بڑے آفیسر موجود تھے۔

اور ماہرین بھی۔

"آئیے پروفیسر صاحب۔ خان رحمان صاحب اور جمشید۔ تمھارا ہی انتظار تھا۔ اب طیاروں کی دُنیا کے سب سے بڑے ماہر مسٹر سرخاب غوری تقریر کریں گے۔ آپ لوگ جانتے ہی ہیں۔ سرخاب غوری ایک ماہر ترین پائلٹ تھے اور اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔" صدر صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ پھر چند سیکنڈ کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ایک ادھیڑ عمر کا صحت مند آدمی اُٹھا۔ اس نے ایک نظر سب پر ڈالی اور پھر کہنے لگا:

"حاضرین! آپ کو معلوم ہے۔ رات کسی وقت ہمارے مُلک کا ایک طیارہ گم ہو گیا، طیارے میں ساڑھے چار سو کے قریب مسافر سوار تھے۔ یہ مسافر بھی عام لوگ نہیں تھے، بلکہ ہمارے مُلک کے ذہین ترین لوگ تھے اور پوری دُنیا میں اسلام کے لیے کوششیں تیز تر کرنے کے سلسلے میں ایک دوست مُلک کے لیے پرواز کر رہے تھے۔ دوست مُلک نے پوری دُنیا کے اسلامی ماہرین کو ایک جگہ جمع کرنے اور سوچ بچار کرنے کا یہ پروگرام ایک سال پہلے ترتیب دیا تھا۔ تاریخ کا اعلان پہلے

ہی کر دیا گیا تھا اور اسلامی حکومتوں سے درخواست
کی گئی تھی کہ وہ مقررہ تاریخ تک اپنے ماہرین
وہاں بھیج دیں ؛ چناں چہ ہمارے ملک کے ساڑھے
چار سو ماہرین اس خاص طیارے میں رات سات
بجے یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ اس قسم کا کوئی
خیال نہیں تھا کہ طیارہ گم ہو جائے گا۔ کوئی خصوصی
انتظامات نہیں کیے گئے تھے۔ بس ایک جہاز کا
انتظام ضرور کیا گیا تھا اور ان لوگوں کو اطلاع تھی
کہ انھیں اس جہاز پر فلاں وقت سفر کرنا ہے۔
وہ سب لوگ وقت پر ایر پورٹ پہنچ گئے تھے اور
جہاز بھی وقت پر روانہ ہو گیا تھا۔ ایر پورٹ سے
اس کا رابطہ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک بحال رہا۔ اس
کے بعد اچانک رابطہ کٹ گیا۔ خیال کیا گیا کہ آلات
میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ جسے جہاز کا عملہ
درست کر لے گا۔ لیکن کافی دیر گزرنے پر بھی
رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ ہر ممکن کوشش کی گئی، لیکن
کچھ نہ بنا۔ جہاز کو دوست ملک صبح سویرے
پہنچنا تھا، لیکن جہاز وہاں نہیں پہنچا۔ اور ہمیں نہیں
معلوم۔ جہاز اس وقت کہاں ہے۔ آیا وہ کسی حادثے

کا شکار ہوا ہے یا کیا واقعہ پیش آیا۔ اس کے
کسی جگہ گرنے کی بھی اطلاع نہیں ملی۔ تمام فضائی
اسٹیشنوں سے معلومات حاصل کی جا چکی ہیں۔
کسی طرف سے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں
ہو سکا۔ آپ لوگوں کو اب یہاں اس لیے جمع
کیا گیا ہے کہ غور کیا جائے۔ اب ہمیں کیا کرنا
چاہیے۔"

آخری الفاظ کہتے وقت سرخاب غوری نے چہرے پر
ہاتھ رکھ لیے۔ اور بیٹھ گیا۔ ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک
آفیسر نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"صبر سے کام لو مسٹر غوری۔"

"ہاں! مسٹر غوری۔ ہم سبھی کو صبر سے کام لینا ہو گا۔
حاضرین۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ مسٹر سرخاب
غوری کے بیٹے کاشف غوری اس جہاز کے پائلٹ ہیں۔"

"اوہ!" کئی آوازیں ابھریں۔

"اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ ہمیں کیا
کرنا چاہیے۔"

"اس سلسلے میں میں ایک تجویز پیش کر سکتا ہوں۔"
انسپکٹر جمشید بول اٹھے۔

"ضرور جمشید — کیوں نہیں۔"

"ڈیڑھ گھنٹے تک جہاز سے رابطہ قائم رہا — یعنی ڈیڑھ گھنٹے تک جہاز بخیریت پرواز کرتا رہا — یہاں ماہرین موجود ہیں — انھیں جہاز کی سمت معلوم ہے — اور یہ بھی کہ وہ کس رفتار سے جا رہا تھا — لہٰذا یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رابطہ ٹوٹنے کے وقت جہاز کس جگہ تھا — ہم اپنی تلاش اس جگہ سے شروع کر سکتے ہیں — میرا مطلب ہے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے — اگر جہاز اپنے ملک کی فضا سے باہر نکل چکا تھا تو بھی پڑوسی ملک سے اس کی تلاش کی اجازت لی جا سکتی ہے — اور ان حالات میں وہ انکار نہیں کرے گا — اگرچہ پڑوسی ملک ہمارا بدترین دشمن ہے۔"

"ہم اس سے بات کر چکے ہیں جمشید۔" صدر صاحب مسکرائے۔

"اوہ! تو پھر سر!"

"اس کا دعویٰ ہے کہ وہ طیارہ اس کی سرزمین میں داخل نہیں ہوا — ہمارے ماہرین کا بھی یہی کہنا ہے کہ طیارے کو اس کی فضا میں سے تو گزرنا ہی نہیں تھا، لہٰذا وہ دشمن ملک میں نہیں گر سکتا تھا۔" ایک ماہر نے کہا —

"تو پھر — کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ طیارہ ابھی

ہمارے ملک کی فضا میں ہی تھا کہ گم ہو گیا۔"

"ہاں! ہم سب کا یہی اندازہ ہے۔"

"تب تو کام اور بھی آسان ہے — ہیلی کاپٹروں" انسپکٹر جمشید نے کہنا چاہا، لیکن صدر صاحب نے بات کاٹ دی:

"نہیں جمشید — اس سے کچھ نہیں بن سکا — ہم یہ کوشش کر چکے ہیں — بلکہ کوشش ابھی جاری ہے — ہیلی کاپٹر ہر طرف اس کو تلاش کر رہے ہیں — وہ ہر ممکن نیچی پرواز کر رہے ہیں اور اگر جہاز ہمارے ملک میں کہیں گرا ہوتا تو اب تک اسے تلاش کیا جا چکا ہوتا — یہی اس واقعے کی سب سے عجیب ترین بات ہے۔"

"تو پھر کیا طیارہ ہمارے ملک سے نکل چکا تھا — اور اب ہم نہیں جانتے کہ دنیا کے کس حصے میں وہ گرا ہے یا اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں — یہ بات بھی نہیں ہے — تمام ماہرین کو اس بات پر یقین ہے کہ طیارہ ہمارے ملک سے ابھی باہر نہیں نکلا تھا۔"

"اوہ — اوہ — تب پھر — اس کو تلاش کیوں نہیں کیا جا سکا — اس کے راستے میں سمندر تو نہیں آتا تھا۔"

"سمندر میں بھی غوطہ خور کام کر رہے ہیں —

اگرچہ سمندر اس کے راستے میں نہیں آتا تھا۔ اور اس بات کا امکان ایک فیصد سے بھی کم ہے کہ طیارہ سمندر میں گر گیا ہو گا۔"

"اُف مالک۔ طیارہ پھر کہاں گیا؟" انسپکٹر جمشید چلّائے۔

"ہاں! یہی اس وقت کا اہم ترین سوال ہے۔ اور ہمیں اس پر غور کرنا ہے۔ تمام ماہرین کو یقین ہے کہ طیارہ مُلک سے باہر نہیں جا سکا، لیکن اگر طیارہ مُلک میں کہیں گرا ہوتا تو اس وقت سے بہُت پہلے اس کو تلاش کیا جا چکا ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔" صدر صاحب بولے۔

"تو پھر۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ طیارہ مُلک سے کہیں باہر گرا ہے۔"

"نہیں۔ میں ماہرین کی رائے سے اتفاق کروں گا، سوال تو صِرف یہ ہے کہ طیارہ کہاں ہے۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا خیال پیش کر سکتے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر ایک ماہر نے اُٹھ کر کہا:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ طیارہ مُلک سے باہر نہیں نِکل سکا تھا۔ جس راستے پر وُہ جا رہا تھا۔ اس راستے سے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر مُلک سے باہر کوئی طیارہ نہیں جا سکتا۔ طیارے کے سمندر میں گرنے کا بھی کوئی امکان نہیں

ہے۔ اب لے دے کے صرف ایک ہی خیال رہ جاتا ہے۔ اور وُہ یہ کہ طیارہ کہیں پہاڑوں پر گر کر بکھر گیا ہے۔ وُہ پوری رفتار سے گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہم اب تک پورا طیارہ تلاش کرتے رہے ہیں۔ طیارے کے ٹکڑے تلاش کرنے کی طرف کِسی نے توجہ نہیں دی۔"

چند لمحے کے لیے پھر خاموشی چھا گئی۔ پھر ایک اور ماہر نے کہا:

"یہ خیال اگرچہ بہت تکلیف دِہ ہے۔ رُوح فرسا ہے، لیکن اس پر کوشش کرنا ہی ہو گی۔ ہیلی کاپٹروں کو اب پہاڑوں اور کھائیوں کی طرف بھیجا جائے تو بہتر رہے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ ایک بات یہ ہو گئی۔" صدر صاحب نے کہا۔

"پہاڑوں پر صرف ہیلی کاپٹر ہی جائزہ نہ لیں۔ بلکہ وہاں کوہ پیماؤں کی ٹیمیں بھی بھیجی جائیں۔ یہ ٹیمیں زیادہ باریک بینی سے جائزہ لے سکتی ہیں۔" ایک اور صاحب نے تجویز پیش کی۔

"یہ بھی معقول تجویز ہے۔" صدر صاحب بولے اور ان کے اسسٹنٹ نے تجویز نوٹ کر لی۔

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ صدر صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انھوں نے ریسیور اُٹھاتے ہوئے کہا:

"میں نے کہا تھا کہ ہمیں پریشان نہ کیا جائے۔"

"لیکن سر۔ طیارے کے بارے میں اگر کوئی اطلاع ملی ہو تو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"اوہ۔ اس صورت میں تو ہم سب پریشان ہونے کے لیے تیار ہیں۔" وہ جلدی سے بولے۔

"ایک صاحب نے فون پر اطلاع دی ہے۔ ان کے والد جہاز پر سوار تھے۔ انھیں کوئی پیغام ملا ہے۔"

"پپ۔ پیغام ملا ہے۔ لیکن کس کی طرف سے؟"

"ابھی انھوں نے یہ وضاحت نہیں کی۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم ان سے ملاقات کرنا پسند کریں گے۔ انھیں یہیں لے آیا جائے۔"

"او کے سر! اسی لیے آپ کو زحمت دی گئی۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

ریسیور رکھ کر صدر صاحب نے فون پر ہونے والی گفت گو دہرا دی اور بولے:

"اب ہمیں ان صاحب کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے۔ ہمیں کوئی نئی بات معلوم ہونے والی ہو۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

انتظار بیس منٹ تک جاری رہا۔ پھر دو ملٹری کے

نوجوان ایک صاحب کو اپنے ساتھ لیے اندر داخل ہوئے:

"یہی صاحب ہیں سر۔" ایک ملٹری مین نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ دونوں باہر ٹھہریں۔ ہم ان سے بات کرتے ہیں۔"

ملٹری مین باہر چلے گئے:

"فرمائیے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"میرا نام مستان راہی ہے۔ میرے والد کا نام فرقان راہی ہے۔ وہ اس گم شدہ جہاز پر سوار تھے۔ ہمیں فون پر ایک پیغام ملا ہے۔ اور وہ پیغام بہت خوف ناک ہے۔"

"کیا مطلب؟" کئی آوازیں ابھریں۔

"پیغام میں کہا گیا ہے۔ کہ اگر ہم لوگ اپنے عزیز کو زندہ سلامت دیکھنا اور حاصل کرنا چاہتے ہیں تو فوری طور پر ایک غیر ملکی بنک میں ایک کروڑ روپے جمع کروا دیں۔ بنک غیر ملکی ہے۔ اگرچہ اس کی شاخ ہمارے ملک میں بھی موجود ہے، لیکن رقم اس شاخ میں جمع کرانے کی ہدایت نہیں دی گئی۔ بلکہ غیر ملک میں ہی جمع کرائی جائے گی۔"

"کون سے ملک میں؟"

"افریقہ کی ایک ریاست شوشان میں۔"

"اوہ!" اُن کے مُنہ سے نکلا۔

"لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جہاز کے مسافر زندہ سلامت ہیں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"فون کرنے والے کا کہنا ہے کہ ہمیں اس کی بات پر اعتبار کرنا ہوگا۔ نہیں کریں گے تو نقصان میں رہیں گے، پھر اپنے عزیز کو کبھی زندہ سلامت نہیں دیکھ سکیں گے۔"

"یہ سراسر دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ کسی شاطر آدمی نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس قسم کا فون کر دیا۔" ایک آفیسر نے جلدی سے کہا۔

"لیکن اس شاطر آدمی کا بنک اکاؤنٹ اس بنک میں ضرور ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس قسم کا پیغام صرف مسٹر مستان راہی کو ہی ملا ہے۔ یا باقی مسافروں کے عزیزوں کو بھی ملا ہے۔ اگر اوروں کو بھی ملا ہے تو یہ معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں رہے گا، پھر ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا ہے۔ یعنی جہاز کو اغوا کرنے کا پروگرام، پہلے ہی بنا لیا گیا تھا۔"

"جہاز کا اغوا۔ اوہ۔" اُن کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"لیکن سوال تو یہ ہے کہ اُنھوں نے اغوا کر کے جہاز کو کہاں رکھا ہے؟"

وہ سب سوچ میں ڈوب گئے۔

"شاید ہم اب تک غلط لائنوں پر سوچتے رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"جی۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جہاز سے رابطہ ضرور ڈیڑھ گھنٹے بعد ختم ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جہاز اسی وقت کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اغوا کرنے والوں نے آلات بے کار کر دیے اور جہاز کی پرواز جاری رکھی۔ یہاں تک کہ وہ جہاز کو اپنے کسی دوست مُلک میں لے کر اُتر گئے۔ اور یہ کام انھوں نے خفیہ طور پر کیا، کیوں کہ جہاز پر سبھی بڑے آدمی موجود ہیں۔ ایک ایک کروڑ روپے ادا کرنا ان کے لیے مشکل نہیں، لیکن دوسری طرف ذرا غور کریں تو ساڑھے چار سو آدمیوں سے جب ایک ایک کروڑ روپے وصول کیے جائیں گے تو یہ کتنی بڑی رقم بنے گی؟"

"اُف مالک!" کئی خوف زدہ آوازیں اُبھریں۔

"ساڑھے چار ارب روپے۔" صدر صاحب کانپ کر بولے۔

"اتنا سرمایہ جب مُلک سے باہر نکل جائے گا تو مُلک کو

کس قدر دھچکا پہنچے گا۔"

" گویا ایک طرف تو یہ سازش ملک کے خلاف ہے۔ دوسرے اسلام کے خلاف۔ اور تیسرے دولت حاصل کرنے کے لیے۔ مطلب یہ کہ ایک پنتھ تین کاج"۔ پروفیسر داؤد بولے۔

" جی ہاں! آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ لیکن افسوس۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" خان رحمان بولے۔

" ایسی کوئی بات نہیں خان رحمان۔ ہم اپنا کام ضرور کریں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

" بہت خوب جمشید۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔" صدر صاحب بولے۔

" کیا جہاز میں ان مسافروں اور عملے کے علاوہ کوئی اور شخص بھی سوار تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" پروگرام میں تو یہ بات شامل نہیں تھی، لیکن ظاہر ہے۔ اغوا کرنے والوں نے کوئی چکر تو چلایا ہوگا۔"

" ہوں! چکر بہت گہرا ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس کے لیے ایک سال تک تیاری کی گئی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے سرسراہٹ زدہ آواز میں کہا۔

" ایک سال تک تیاری۔" کئی آوازیں ابھریں۔

" جی ہاں جناب۔ اس وفد کے جانے کا پروگرام ایک سال پہلے بن چکا تھا۔ اعلان ہو چکا تھا۔"

" تو یار لوگ اسی وقت تیاری میں مصروف ہو گئے جہاز کے اغوا کی۔" ایک صاحب بولے۔

" ہاں! اس کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔"

" مم۔ میں کیا کروں جناب عالی۔" مستان راہی بولا۔

" کیا آپ ایک کروڑ روپے جمع کرانے کی پوزیشن میں ہیں؟"

" ہاں! کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔

" لیکن میرے دوست۔ آپ کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ ایک کروڑ روپے ادا کر کے بھی اگر آپ اپنے والد کو حاصل نہ کر سکے تو کیا ہوگا، پھر آپ کے احساسات کیا ہوں گے، فرض کریں۔ وہ ایک کروڑ روپے وصول کر لیتے ہیں، لیکن آپ کے والد کو رہا نہیں کرتے۔ بلکہ پھر ایک کروڑ روپے کا مطالبہ اور داغ دیتے ہیں۔ تو آپ کیا کریں گے۔"

مستان راہی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ پتھر کا بت بنا ان کی طرف دیکھتا رہا۔ عین اسی وقت فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔

رنگ اڑ گیا

"ہاں بھئی۔ اب کیا ہے۔" صدر صاحب نے منہ بنایا۔

"ایک اور صاحب جہاز کے بارے میں اطلاع دینا چاہتے ہیں۔"

"اوہ اچھا۔ میں سن رہا ہوں۔" انھوں نے کہا، جلد ہی ایک آواز ابھری:

"ہیلو سر۔ میں الیاس کورو ہوں۔ میرے بڑے بھائی گم شدہ جہاز پر وفد میں شامل تھے۔ ایک نامعلوم فون موصول ہوا ہے۔ اس میں مجھ سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ میں ایک کروڑ روپے ایک غیر ملکی بنک میں جمع کرا دوں، ورنہ اپنے بھائی کو زندہ نہیں دیکھ سکوں گا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا، پھر انھوں نے کہا:

"آپ بھی یہیں چلے آئیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا اور بولے:

"اب شاید فونوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جمشید اب کیا کریں؟"

"پہلی بات تو یہ کہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ وہ نامعلوم شخص فون کہاں سے کر رہا ہے۔ جہاز کے مسافروں کے تمام رشتے داروں کو اس صورتِ حال کی اطلاع دی جائے۔ وہ ہوشیار رہیں اور ٹیلی فون کے محکمے کو اپنا اپنا نمبر نوٹ کروا دیں۔ تاکہ جلد از جلد اس کا سراغ لگانے کی کوشش کی جا سکے۔ مجھے تمام مسافروں اور عملے کے تمام ارکان کے نام، پتے اور فون نمبروں کی فہرست دے دی جائے۔ تاکہ میں اپنے طور پر کوشش کر سکوں۔ اب مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ جہاز کسی جگہ صحیح سلامت اتارا گیا ہے۔ لیکن کہاں۔ یہ ہمیں معلوم کرنا ہے۔ ایک بار ہم سازشیوں تک پہنچ جائیں، پھر ان کو ناکام بنانا ہمارا کام ہو گا۔" وہ کہتے چلے گئے۔

"ٹھیک ہے جمشید۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر تمھیں یہ چیزیں مل جائیں گی۔ اور تجاویز پر بھی فوری طور پر عمل شروع کیا جا رہا ہے۔" انھوں نے کہا اور فون پر جٹ گئے۔

ایک گھنٹے بعد انھیں تمام کاغذات مل گئے۔ اور وہ وہاں
سے روانہ ہوئے۔
"میرا خیال ہے، اب اس جہاز کو تلاش کرنا کوئی مسئلہ
نہیں رہا۔" خان رحمان بولے۔
"وہ کیسے انکل؟" فرزانہ چونکی۔
"اس طرح کہ اب ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ جہاز
کسی جگہ اُتارا گیا ہے۔ تباہ نہیں ہوا۔ اس کو اُتارنے
کی باقاعدہ سازش کی گئی ہے۔ پہلے اسے اغوا کیا گیا
اور پھر کسی خاص مقام پر اُتار لیا گیا۔ اب سب مُسافر
اور جہاز کا عملہ سازشیوں کی قید میں ہیں۔ ہمارے ماہرین
اس جگہ کا پتا چلا ہی لیں گے، کیوں کہ جہاز کوئی چھوٹی
سی چیز نہیں ہوتا۔" خان رحمان کہتے چلے گئے۔
"ہاں! خان رحمان ۔ تم ٹھیک کہتے ہو ۔ جہاز واقعی
چھوٹی سی چیز نہیں ہوتا، لیکن ۔ یہ بات سازشیوں کے بھی
ذہن میں رہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے ۔ جہاز ہمارے کسی
دُشمن مُلک میں اُتارا گیا ہو، اس صُورت میں ہمارے لیے
اور بھی مُشکل ہو گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
"لیکن بھئی ۔ دُشمن مُلک میں اُتارنے کی صُورت میں سازشی
کچھ زیادہ فائدے میں نہیں رہیں گے ۔ فائدہ تو دُشمن مُلک

اُٹھانے کی کوشش کرے گا اور سازشی ہاتھ ملتے رہ جائیں گے،
لہٰذا زیادہ امید یہی ہے کہ جہاز کو ہمارے مُلک میں ہی
کہیں اُتارا گیا ہے۔ لیکن کہاں ۔ یہ ہمیں معلوم کرنا ہے۔"
"میرا خیال ہے ۔ یہ بات ہمارے ماہرین کے علم
میں ہو گی کہ جہاز کو اپنے مُلک میں کسی جگہ اُتارا جا سکتا
ہے یا نہیں۔"
"کیا ہمیں بھی پچھلی مہم میں ایک ایسا تجربہ نہیں ہو چکا؟"
فرزانہ چونکی۔
"اوہ ہاں ۔ ہم ریگستان کے قریب اُترے تھے ۔ لیکن
بھئی ۔ وہ جہاز چھوٹا تھا ۔ یہ ایک بڑا جہاز ہے۔" انسپکٹر
جمشید بولے۔
"تو پھر پہلے ماہرین سے اس پر کیوں نہ رائے لے لی
جائے کہ مُلک میں ایسی کون سی جگہ ہے۔ جہاں ایک بڑا
جہاز اُتارا جا سکتا ہے؟"
"ہاں! ان سے ضرور رائے لی جائے گی، فکر نہ کرو۔"
انسپکٹر جمشید نے کہا۔
گھر پہنچ کر انھوں نے فون سنبھال لیا۔ پہلے تو ماہرین
کی ٹیم کو فون کیا اور اپنا خیال ظاہر کر کے ان کی رائے
معلوم کی ۔ انھوں نے وعدہ کیا کر آدھ گھنٹے بعد جواب

دیا جائے گا۔ اس کے بعد انسپکٹر جمشید نے جہاز کے مسافروں
کے گھروں کے نمبر ملانے شروع کیے۔ وہ باری باری ان
سے یہ معلوم کرتے گئے کہ انھیں اغوا کرنے والوں کی طرف
سے کوئی پیغام ملا یا نہیں۔ یہ کام بہت اُکتا دینے والا
تھا، لیکن انھیں کرنا تھا۔ وہ ناموں کے سامنے نشان
لگاتے چلے گئے۔

اور پھر آدھ گھنٹے بعد ماہرین کی ٹیم کی طرف سے فون
موصول ہوا:

"اس پر غور کیا گیا۔ ملک میں صرف ایک جگہ ہو
سکتی تھی۔ جہاں چوری چھپے جہاز کو اُتارا جا سکتا تھا۔
لیکن اب وہ جگہ اس قابل نہیں۔ پچھلی جنگ میں اس
جگہ بڑے بڑے بم گرے تھے۔ اور وہ بے کار ہو گئی
تھی۔"

"وہ جگہ کون سی ہے؟"

"راجا آباد کا پرانا ایرپورٹ۔ کسی زمانے میں اس
شہر میں ایرپورٹ تھا، لیکن پھر ختم کر دیا گیا۔ ایرپورٹ
یوں ہی پڑا رہ گیا۔ پچھلی جنگ میں اس ایرپورٹ
پر بم گرے تھے۔ اخباری رپورٹروں نے جا کر اس جگہ کا
جائزہ لیا تھا۔ وہ بہت گہرے گہرے گڑھے بن گئے تھے،

لٰہذا جہاز اس جگہ نہیں اُتارا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ
اور کوئی جگہ ملک میں ایسی نہیں۔"

"ہوں! بہت بہت شکریہ۔ کیا اس سلسلے میں پائلٹ
حضرات کی رائے بھی لی جا چکی ہے؟" وہ بولے۔

"ہاں! بالکل۔ یہ سب کی متفقہ رائے ہے۔"

"شکریہ!" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"خان رحمان۔ راجا آباد یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"تقریباً نو سو کلومیٹر۔"

"اور یہ راجا آباد اب ایک بے آباد سا شہر ہے۔ پہلے
کبھی ضرور بہت آباد تھا، لیکن پھر سیم کی وجہ سے اُجڑ کر
رہ گیا۔ اور شاید اسی لیے وہاں سے ایرپورٹ بھی ختم
کرنا پڑا تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! تمھارا خیال ٹھیک ہے۔ تو کیا تم اس ایرپورٹ
کا جائزہ لینے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سازشیوں کے پاس پورا ایک
سال تھا۔ اگر ان کا پروگرام یہی تھا تو ایک سال کا عرصہ
ان گڑھوں کو پاٹنے کے لیے بہت کافی تھا۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔" پروفیسر داؤد پُرجوش انداز
میں بولے۔

"لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم فوری طور پر ادھر روانہ ہو جائیں۔ ہم پہلے سازش کا جائزہ اپنے شہر میں ہی لیں گے۔ میرا مطلب ہے۔ سازش پر عمل تو یہیں کیا گیا ہے نا۔ ذرا غور کریں۔ جہاز کو اغوا کیا گیا ہے صاف ظاہر ہے۔ یا تو عملے میں کوئی غلط آدمی شامل ہوا ہو گا۔ یا پھر مسافروں میں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"اور پھر اغوا کرنے والوں نے ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد اچانک پستول نکال لیے ہوں گے۔ پائلٹ کو جہاز کا رخ موڑنے پر مجبور کر دیا ہو گا۔"

"چلیے خیر۔ فی الحال ہم یہ بات مان لیتے ہیں کہ اس طرح جہاز کو اغوا کر لیا گیا، سوال یہ ہے کہ عملے میں یا مسافروں میں غلط آدمی کس طرح شامل ہوئے۔"

"ہاں! اس پر غور کرنا ہو گا۔ مسافروں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ ہم چیک کرنے میں وقت نہیں ضائع کر سکتے، لیکن جہاز کے عملے کو ضرور چیک کیا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ آپ کیا کہ رہے ہیں۔ بھلا ہم انہیں کس طرح چیک کر سکتے ہیں۔ وہ تو جہاز پر ہیں۔" فاروق نے حیران ہو

کر کہا۔

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ ہم ان کے گھر والوں کو چیک کر سکتے ہیں۔"

"لیکن گھر کے افراد کو چیک کر کے کیا ہو گا۔"

"شاید کوئی بات سامنے آ جائے۔" انھوں نے کہا۔

"تو پھر بسم اللہ کریں۔"

"جہاز کے پائلٹ کا نام کاشف غوری ہے۔ اس کے باپ سے ہماری ملاقات ایوانِ صدر میں ہو ہی چکی ہے، لیکن اس وقت ہم نے راجا آباد کے ایر پورٹ کا نام نہیں سُنا تھا۔ ہو سکتا ہے مسٹر سرخاب غوری اس کے بارے میں ہمیں کوئی مفید بات بتا سکیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ ہمیں ان سے ضرور ملنا چاہیے۔"

"آؤ پھر چلیں۔"

اور وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ بیس منٹ بعد وہ سرخاب غوری کے سامنے بیٹھے تھے۔ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے بالکل سُرخ ہو چکی تھیں۔

"بہت جلد ہماری مُلاقات دوبارہ ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"جی ہاں! ایک نیا خیال ماہرین کے ذہن میں آیا

ہے ۔ اور وہ یہ کہ جہاز کو اغوا کر کے ملک سے باہر ہرگز نہیں لے جایا گیا۔"

" تو پھر اس کو کہاں اُتارا گیا ہے؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

" راجا آباد کے پُرانے اور بے کار ایرپورٹ پر۔"

" نہیں ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" سرخاب غوری کے لہجے میں حیرت تھی۔

" یہ بات شاید آپ نے اس خیال سے کہی ہے کہ بمباری کی وجہ سے اس میں بڑے بڑے گڑھے پڑ چکے ہیں؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

" ہاں ! بالکل۔"

" لیکن جناب ۔ اس جہاز کے اغوا کا پروگرام ایک سال پہلے بنا لیا گیا تھا، اور گڑھے پُر کرنے کے لیے ایک سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔"

" اوہ!" سرخاب غوری دھک سے رہ گیا، پھر اس نے کانپتی آواز میں کہا:

" اس ۔ اس کا مطلب ہے ۔ جہاز وہاں ہے ۔ تب تو میرے بیٹے کے بخیریت واپس آنے کی امید کی جا سکتی ہے۔"

" جی ہاں ! کیوں نہیں ۔ ہم وہیں جا رہے ہیں ۔ آپ

ہماری کامیابی کی دُعا کیجیے گا۔"

" اوہ ۔ اوہ ۔" وہ پُرجوش انداز میں بولا۔

" پرواز سے پہلے آپ کے بیٹے کاشف غوری بالکل پُرسکون اور خوش تھے نا؟"

" ہاں! بالکل ۔ یہ کیوں پوچھا آپ نے؟" وہ چونکا۔

" آپ نے انھیں بے چین تو نہیں پایا؟"

" ہرگز نہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

" اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ انھیں اغوا کے بارے میں قطعاً کوئی اطلاع نہیں تھی۔"

" ہوتی بھی کیسے۔" سرخاب غوری بولا۔

" آپ ہمیں اپنے بیٹے کی کوئی تصویر دے سکتے ہیں۔"

" جی ہاں ! کیوں نہیں ۔ اس کی تو بہت سی تصاویر ہیں۔"

اس نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا، جلد ہی اس کی واپسی ہوئی ۔ ہاتھ میں تین تصویریں تھیں ۔ انسپکٹر جمشید نے تصاویر کو ہاتھ میں لیا اور ان پر ایک نظر ڈالی، تصویر ایک ہنس مکھ نوجوان کی تھی ۔ چند سیکنڈ تک اس کا بغور جائزہ لینے کے بعد انھوں نے کہا:

" یہ تصاویر میرے پاس رہیں گی ۔ اب ہمیں اجازت دیں۔"

" بہت بہتر۔"

وہ وہاں سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھے:

"آپ یہاں سے سیدھے راجا آباد جائیں گے یا ابھی کچھ اور کام نبٹانے ہیں؟" انھوں نے سرخاب غوری کی آواز سُنی۔

"ابھی کچھ اور لوگوں سے ملاقاتیں کریں گے، پھر روانہ ہوں گے۔"

"بہت اچھا۔" اس نے کہا۔

"آپ نے یہ کیوں پوچھا؟"

"بس — میں چاہتا ہوں، آپ لوگ اُڑ کر وہاں پہنچ جائیں، کیوں کہ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ جہاز وہیں ہے۔"

"ہم جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے، فکر نہ کریں۔"

آخر وہ اُس سے رخصت ہوئے اور اختر کاشوکی کی کوٹھی پہنچے — یہ جہاز میں نائب پائلٹ تھا۔ دستک کے جواب میں ایک لڑکے نے دروازہ کھولا، اس کی آنکھیں بھی رونے کی وجہ سے سُرخ تھیں۔ دروازے کے اندر کئی کاریں کھڑی تھیں۔ شاید بہت سے عزیز غم کا اظہار کرنے آئے تھے —

"فرمائیے — آپ کیسے تشریف لائے؟"

"مسٹر اختر کاشوکی گم شدہ جہاز کے سیکنڈ پائلٹ تھے نا؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی ہاں بالکل!"

"ہم اس سلسلے میں تحقیقات کر رہے ہیں — ان کے والد یا بھائی سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اندر بہت سے لوگ بیٹھے ہیں — میں آپ کو کسی کمرے میں بٹھا دیتا ہوں اور ان میں سے کسی کو یہیں بھیج دیتا ہوں۔" لڑکا بولا۔

"یہ زیادہ مناسب رہے گا — کیا آپ اختر صاحب کے بیٹے ہیں؟"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"تب تو آپ ذرا ٹھہریے — ہم ایک دو سوال آپ سے بھی کرنا پسند کریں گے — اس جہاز پر روانہ ہونے سے پہلے آپ کے ابّو بے چین یا پریشان تو نہیں تھے؟"

"جی ہاں! بالکل تھے۔" اس نے فوراً کہا۔

"کیا کہا — بالکل تھے؟" محمود چونکا۔

"ہاں! بالکل — بہت بے چین اور پریشان تھے — ہم سب نے ان سے بے چینی کی وجہ پوچھی تھی، لیکن وہ کوئی وجہ نہیں بتا سکے تھے — بس اتنا ہی کہا تھا — انھیں کوئی

خطرہ محسوس ہو رہا ہے انجانا خطرہ۔"

"ہوں۔ اس صورت میں انھوں نے جانے کا پروگرام کینسل کیوں نہ کر دیا۔"

"ان کا خیال یہ تھا کہ شاید انھیں وہم ہو گیا ہے۔"

"آپ لوگوں کو جہاز کے بارے میں کوئی فون تو موصول نہیں ہوا؟"

"جی نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"اچھا۔ کسی بڑے کو بلا لائیں۔ اگرچہ ہمیں امید ہے۔ وہ آپ سے بہتر باتیں نہیں بتا سکیں گے۔"

"جی کیا مطلب؟" لڑکا چونکا۔

"کک۔ کچھ نہیں۔ پہلے آپ بلا لائیں۔"

لڑکا انھیں ایک کمرے میں بٹھا کر چلا گیا۔ پھر ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا اور بولا:

"میں اختر کا باپ ہوں۔ فرمائیے۔ آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

"جانے سے پہلے وہ بے چین یا پریشان تھے؟"

"کوئی خاص نہیں۔ وہ جب بھی پرواز پر جانے لگتا، اسی طرح بے چین ہو جاتا تھا۔" اس نے کہا۔

"گویا اس مرتبہ وہ خاص طور پر بے چین نہیں تھے۔"

"جی نہیں۔"

"حیرت ہے۔ آپ ذرا بھی فکر مند نہیں لگ رہے۔" انسپکٹر جمشید نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"فکر کی کون سی بات ہے۔ ایک دن سب کو مرنا ہے، میرا بیٹا اگر حادثے کا شکار ہو چکا ہے تو میں اسے واپس نہیں لا سکتا۔" اس نے کہا۔

"شکریہ۔ اب ہم اجازت چاہیں گے۔"

"بس۔ صرف یہ چند باتیں پوچھنے آئے تھے آپ۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں۔ بس۔" وہ مسکرا دیے۔

ان کا رخ اب ایک ایر ہوسٹس کے گھر کی طرف تھا۔ ایک ملازم انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ وہ ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگے۔ اچانک فرزانہ کو شدید بے چینی کا احساس ہوا۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا:

"خیر تو ہے فرزانہ؟"

"پپ۔ پتا نہیں۔ کیوں میں بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔" فرزانہ بولی۔

"اچھا۔ کوئی صاحب آ رہے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے اپنی

بے چینی کو چین سے رکھو۔" فاروق نے بھنا کر کہا۔

اسی وقت ایک لمبے قد کا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ تھی۔ ادھر انھوں نے محسوس کیا، فرزانہ کا رنگ اسے دیکھ کر اور اڑ گیا۔

اب تو ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

خُفیہ ٹھیکا

"مس زوبی منیر سے آپ کا کیا تعلق ہے؟" انسپکٹر جمشید نے فرزانہ کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ آنے والے نے فرزانہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"میں ان کا بھائی ہوں۔ فیاض منیر میرا نام ہے۔ میں سمجھ نہیں سکا، آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔" اس نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"آپ تشریف رکھیے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا، کیوں کہ کمرے کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے کہنے پر وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔

"آپ کی بہن گم ہونے والے جہاز پر ایر ہوسٹس کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ یہ بات ٹھیک ہے؟"

"جی ہاں بالکل۔ ہم تو سب اسی کی وجہ سے پریشان

ہیں۔ سارے گھر پر موت کی کیفیت طاری ہے۔" اس نے کہا۔

" ہاں! ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ ہم اس جہاز کے سلسلے میں تفتیش کر رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کارڈ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

" حیرت ہے۔ آپ لوگوں کے گھروں میں اتنے بڑے جہاز کو تلاش کر رہے ہیں؟" اس نے انھیں گھورا۔

" ہاں! کبھی کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ جہاز کو ایک باقاعدہ سازش کے تحت اغوا کیا گیا ہے، صاف ظاہر ہے۔ سازش جہاز سے باہر رہتے ہوئے کی گئی تھی۔ لہٰذا اس کا سراغ بھی جہاز میں نہیں، جہاز کے باہر ہی لگایا جا سکتا ہے، ہم دراصل سازش کا سراغ لگا رہے ہیں۔ جہاز کی تلاش میں تو ماہرین کی نہ جانے کتنی پارٹیاں کام کر رہی ہیں۔"

" ہوں! میں سمجھ گیا۔ آپ تو بہت مشہور آدمی ہیں۔" اس نے کارڈ پر نام پڑھتے ہوئے کہا۔

" جی بس۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے۔ پرواز سے پہلے مس زوبی کی کیا کیفیت تھی؟"

" جی۔ کیا مطلب۔" اس نے چونک کر کہا۔

" کیا وہ پوری طرح پرسکون تھیں۔ یا آپ نے انھیں بے چین محسوس کیا تھا؟"

" میرا خیال ہے۔ وہ مکمل طور پر پرسکون تھیں۔" اس نے کہا۔

" وہ جب بھی کسی پرواز پر جاتی تھیں، پرسکون ہی رہتی تھیں؟"

" ہاں بالکل۔ آخر یہ اس کا روز کا کام ہے۔"

" آپ کیا کام کرتے ہیں؟" فرزانہ بول اٹھی۔ اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر بولا:

" کیوں۔ آپ نے یہ کیوں پوچھا؟"

" جی بس ایسے ہی۔ کیا بتانے میں کوئی حرج ہے؟" فرزانہ مسکرائی، اب اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا تھا۔

" نہیں۔ کیا حرج ہو سکتا ہے بھلا۔ میں ایک ٹھیکیدار ہوں، سڑکیں بناتا ہوں۔ گورنمنٹ کی طرف سے ٹھیکے ملتے ہیں مجھے سڑکیں بنانے کے۔"

" اوہ اچھا۔ کبھی کسی ایرپورٹ کی سڑکیں بنانے کا بھی اتفاق ہوا ہے؟" فرزانہ بولی۔

" جی ہاں! اس شہر کے ایرپورٹ کی سڑکیں میں نے ہی بنوائی تھیں۔ یہ کافی پرانی بات ہے۔"

"گویا آپ نوجوانی میں ہی یہ کام کرنے لگ گئے تھے۔"

"ہاں! ہمارے والد صاحب بھی یہی کام کرتے تھے۔ اس وقت میں ان کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اب وہ فوت ہو چکے ہیں۔"

"اس شہر میں کوئی اور ایئر پورٹ بھی بنوایا ہے آپ نے، یا پورے ملک میں؟"

"نن۔ نہیں۔" اس نے کہا۔

"اگر ہم کسی جہاز کو اغوا کرنا چاہیں۔ اور پروگرام یہ ہو کہ اپنے ملک میں ہی جہاز کو کہیں اتارا جائے تو اس کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ ملک کے کس حصے میں ایک وقتی ایئر پورٹ بنانا ہوگا۔" فرزانہ بولی۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" وہ دھک سے رہ گیا۔

"ہمارا خیال یہی ہے۔ ایسا ہی کیا گیا ہے۔"

"اوہو اچھا۔ کمال ہے۔ ایک جہاز کو اغوا کرنے کے لیے پورا ایک ایئر پورٹ پہلے بنایا گیا۔" وہ بوکھلا کر بولا۔

"ہاں! کیا آپ کے خیال میں، ایسا نہیں کیا جا سکتا۔"

"اس طرح بھلا جہاز کو اغوا کرنے والوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ایئر پورٹ پر بھی تو انھیں لاکھوں روپے خرچ

کرنا پڑیں گے۔"

"جب معاملہ اربوں روپے حاصل کرنے کا ہو تو لاکھوں روپے خرچ کیے جا سکتے ہیں۔" محمود بولا۔

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔

"آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" فرزانہ نے کہا۔

"کک۔ کون سے سوال کا۔"

"ایسا ایئر پورٹ ملک میں کس جگہ بنایا جا سکتا ہے؟"

"میں نہیں جانتا اور جان بھی کس طرح سکتا ہوں۔ جب کہ میں نے اس پہلو سے کبھی نہیں سوچا۔"

"ہوں! آپ کبھی راجا آباد ایئر پورٹ گئے ہیں؟"

"جی نہیں! میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں سڑکیں بنانے کے ٹھیکے لیتا ہوں، یہ نہیں کہا تھا کہ صرف ایئر پورٹ کی سڑکیں بنانے کے ٹھیکے لیتا ہوں۔ بھلا میرا ایئر پورٹوں سے کیا واسطہ۔" اس نے برا مان کر کہا۔

"ہوں! بات آپ کی ٹھیک ہے، میں معافی چاہتی ہوں، ابا جان آپ ان سے کچھ پوچھنا پسند کریں گے۔"

"ہاں ایک دو سوال۔ کیا آپ کا کوئی باقاعدہ دفتر ہے؟"

"جی ہاں! شارع بہار پر فیاض اینڈ کو کے نام سے

میرا ایک بڑا دفتر موجود ہے۔"

" آپ اس دفتر میں کس وقت ہوتے ہیں؟"

" وہاں میری موجودگی ضروری نہیں۔ کبھی کبھار چلا جاتا ہوں۔"

" اِن دنوں آپ کسی ٹھیکے پر کام کر رہے ہیں؟"

" جی نہیں۔ اِن دنوں فارغ ہوں۔ سڑکیں بنانے کا کام گرمیوں میں کیا جاتا ہے۔ اور ان دنوں موسم سرما ہے۔"

" شکریہ۔ اب ہم چلیں گے۔" یہ کہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

" ارے ارے۔ تشریف رکھیے۔ ابھی چائے آجاتی ہے۔"

" نہیں! ہم اس وقت چائے نہیں پیتے۔ آپ زحمت نہ کریں۔"

وہ باہر نکل کر جیپ میں بیٹھے۔ اور روانہ ہوئے:

" ہاں فرزانہ۔ اب بتاؤ۔ تم کیوں پریشان تھیں۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی تم پریشان ہوگئی تھیں اور فیاض منیر کو دیکھ کر تو تمھاری پریشانی میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ آخر کیوں؟"

" جی ہاں! دراصل ڈرائنگ روم میں فیاض منیر کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ میں اس تصویر کو دیکھ کر پریشان ہوئی تھی اور جب خود تصویر والا شخص اندر داخل ہوا

تو میری پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔"

" لیکن کیوں۔ اس کے چہرے میں تمھیں ایسی کیا بات نظر آئی تھی۔" فاروق بولا۔

" افسوس! میں کچھ نہیں بتا سکتی۔"

" کیا مطلب۔ کچھ نہیں بتا سکتیں۔ بتانا نہیں چاہتیں یا بتا نہیں سکتیں۔" محمود نے منہ بنایا۔

" بتا نہیں سکتی، کیوں کہ میں نہیں جانتی۔ میں اس کے چہرے کو دیکھ کر کیوں پریشان ہوگئی تھی۔"

" یہ کیا بات ہوئی۔" خان رحمان بولے۔

" بھئی بات تو خیر ہوئی ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

" کیا مطلب۔ کیسے بات ہوئی ہے۔"

" شاید فرزانہ نے اس کے چہرے کو کہیں دیکھا ہے۔ اور جس جگہ یا جس سلسلے میں دیکھا ہے۔ وہ خوش گوار نہیں تھا۔ اسی لیے یہ پریشان ہوگئی۔" انھوں نے کہا۔

" کیوں فرزانہ۔ یہی بات ہے؟"

" ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔ میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔" فرزانہ نے کہا۔

" آخر تم کچھ کہہ بھی سکتی ہو۔" فاروق نے جل کر کہا۔

" بس یہی۔ کہ اس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا لگا ہے۔

اور یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ کسی ناخوش گوار سلسلے میں میں نے اس چہرے کو دیکھا ہے۔ دُوسری بات یہ کہ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سنگ دلی نظر آتی ہے مجھے۔"

"یہ بات تو خیر میں نے بھی محسوس کی ہے۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"خیر۔ ہم اس کی نگرانی شروع کرا دیتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

"اس کے علاوہ۔ میں لائبریری میں جانے کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔"

"اوہ۔ تم شاید اخبارات میں اس کی تصویر تلاش کرو گی۔" محمود چونکا۔

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم فی الحال گھر چلے چلتے ہیں۔"

پچھلی مہم کے دوران گھر تباہ ہو جانے کی وجہ سے لائبریری تباہ ہو گئی تھی۔ انسپکٹر جمشید نے اپنے کچھ دوستوں اور چند ماتحتوں کی مدد سے بہت محنت سے دوبارہ لائبریری قائم کی تھی۔ انھوں نے پہلے تو فیاض منیر کی نگرانی کی

ہدایات دیں، پھر گھر پہنچے۔

"میرا خیال ہے ہم سبھی لائبریری میں اس کی تصویر کی تلاش میں جُٹ جاتے ہیں۔"

"یہ زیادہ بہتر رہے گا۔" فرزانہ مُسکرائی۔

اخبارات کی فائلیں ڈھیر کر دی گئیں اور ان کا جائزہ شروع کیا گیا۔ وُہ تین گھنٹے تک جُٹے رہے، لیکن فیاض منیر کی تصویر کہیں بھی نظر نہ آئی۔

"فرزانہ کو ضرور وہم ہو گیا ہے اور اس نے ہماری زندگی کے یہ تین گھنٹے اپنے وہم کی نذر کر دیے ہیں۔" فارُوق نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"میں وہمی نہیں ہُوں۔ فیاض منیر کی تصویر کہیں نہ کہیں ضرور دیکھ چکی ہُوں۔ اور دیکھی بھی کسی خطرناک معاملے میں ہے۔ ورنہ تصویر میرے ذہن سے چپک کر ہرگز نہیں رہ سکتی تھی۔ ہم روزانہ نہ جانے کتنی تصویریں دیکھتے ہیں، لیکن ذہن سے چپک جانے والی تصویر کبھی کبھار ہی دیکھتے ہیں۔"

"میں فرزانہ کی بات کو درست مانتا ہُوں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"لیکن انکل۔ ہمیں اخبارات میں وُہ تصویر نظر کیوں

نہیں آئی۔"

"اوہ۔ دراصل ہم سے غلطی ہوئی ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی کیا مطلب؟"

"ہمیں اس سلسلے میں اکرام سے مدد لینی چاہیے تھی۔"

"لیکن انھوں نے فیاض منیر کو دیکھا کب ہے۔ پہلے تو انہیں جا کر فیاض منیر کو دیکھنا پڑے گا۔"

"ہاں! یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہم کیوں نہ اس کا ریکارڈ دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے، فیاض منیر کی تصویر اس کے ریکارڈ میں موجود ہو۔"

"یہ بھی کر دیکھتے ہیں۔"

اکرام کو فون کیا گیا۔ وہ جلد ہی سارا ریکارڈ اٹھا لایا، پہلے اسے ساری بات بتائی گئی۔ اس نے سن کر کہا:

"مجھے اس کا حلیہ بتا دیں۔ اگر حلیے سے کام نہ چلا تو میں کسی بہانے سے جا کر اسے دیکھ آؤں گا۔"

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور پھر فیاض منیر کا حلیہ بتانے لگے:

"اس کا قد لمبا، جسم دبلا پتلا۔ چہرہ لمبوترا، ناک کی نوک پر ابھرا ہوا سیاہ تل۔ آنکھیں گہری سیاہ۔ گالوں کی

ہڈیاں ابھری ہوئیں۔"

اکرام چند لمحے سوچتا رہا، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا:

"نہیں۔ کام نہیں چل رہا۔"

"اچھا تو پھر تم جا کر اسے ایک نظر دیکھ آؤ۔" انھوں نے کہا۔

اکرام چلا گیا۔ پینتالیس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی:

"کیوں بھئی۔ کیا رہا۔ دیکھ آئے۔"

"جی ہاں! لیکن یہ چہرہ میرے ریکارڈ میں نہیں ہو سکتا۔ تاہم۔ مجھے ایک خیال ضرور سوجھا ہے۔"

"اور وہ کیا؟"

"خاکہ۔ کہیں فرزانہ نے کسی کا خاکہ تو نہیں دیکھا تھا اور اس خاکے کے نقش و نگار فیاض منیر سے مل گئے ہوں۔"

"ہوں! اس کا امکان ہے۔ پولیس کے آرٹسٹ نے کسی مجرم کی خیالی تصویر کسی کے بتانے پر بنائی ہو۔ اور اس کو اخبار میں شائع کیا گیا ہو۔ اس طرح وہ خاکہ فرزانہ نے دیکھا ہو۔" انسپکٹر جمشید یہ کہتے وقت فرزانہ کی طرف دیکھنے لگے۔ ادھر فرزانہ کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے خاموش ہوتے ہی اس نے کہا:

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ مجھے یاد آ گیا۔ مَیں نے خاکہ ہی دیکھا تھا۔"

"لیکن کہاں؟" محمود بے چین ہو کر بولا۔

"کسی اخبار میں ہی۔ ہاں! اب مجھے یاد آ گیا۔ ایک شخص گم ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ جس شخص کو دیکھا گیا، اس کا خاکہ اخبار میں شائع ہوا تھا۔"

"اب معاملہ آسان ہو گیا۔ ٹھہریے مَیں گم شُدگی کا ریکارڈ چیک کرتا ہُوں۔ اس میں خاکے بھی بنے ہوتے ہیں۔" اکرام نے کہا اور ایک بار پھر ریکارڈ کا جائزہ لینے لگا۔ جلد ہی اس نے چند خاکے فرزانہ کے سامنے کر دیے، اور پھر فرزانہ نے ایک خاکے پر اُنگلی رکھ دی:

"اس کی تاریخ نو ماہ پُرانی ہے۔ نکالیے اب پھر اخبارات۔"

اس تاریخ کے اخبارات نکالے گئے۔ اس میں واقعی وُہ خاکہ مَوجُود تھا۔ اور ایک شخص فاخر کریم کی گم شُدگی کے سِلسلے میں تھا۔ اکرام کے ریکارڈ میں بھی یہی چیز درج تھی۔ اب ان سب نے خاکے کو بغور دیکھا تو وُہ واقعی فیاض منیر سے مِلتا جُلتا نظر آیا۔

"حیرت ہے۔ فرزانہ کی یادداشت پر۔" فارُوق بڑبڑایا۔

"واقعی۔ یہ تو کمال کی بات ہو گئی۔"

"بھئی ٹھہرو۔ پہلے فاخر کریم کے بارے میں تو پڑھ لیں۔ اس بے چارے کے ساتھ کیا گزری۔"

ان کی نظریں اس تفصیل پر جم گئیں۔ لکھا تھا:

"کل شام کے وقت فاخر کریم گھر سے سیر کے لیے اپنی کار میں نکلا۔ اور پھر لوٹ کر نہ آیا۔ اس کی کار ایک کھڈ میں پڑی ملی۔ لاش بھی کار میں ہی پائی گئی۔ ماہرین نے اندازہ لگایا کہ کار بے قابو ہو کر کھڈ میں جا گری۔ اور فاخر کریم ہلاک ہو گیا۔ لیکن تفتیش کرنے والے پولیس انسپکٹر زاہد نے یہ بات تسلیم نہیں کی۔ اس نے کاروں کے ایک ماہر کے ذریعے کار کو چیک کرایا۔ کار میں کوئی خرابی نہیں پائی گئی۔ سڑک پر بریک وغیرہ لگنے کے کوئی نشانات نہیں پائے گئے۔ اگر کار بے قابو ہوتی تو بریک لگنے کے نشانات ضرور ملتے۔ لہٰذا اس نے اندازہ لگایا کہ کار کو کھڈ میں دھکیلا گیا ہے اور اس سے پہلے فاخر کریم کو کار کے اندر ہی بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کار جب

اس جگہ پہنچی - تو فاخر کریم کے ساتھ کوئی اور
بھی تھا - اس نے کار روکنے کے لیے کہا -
فاخر نے کار روک دی - اس نے پیچھے سے
کلوروفارم والا رومال فاخر کی ناک پر رکھ دیا،
وہ بے ہوش ہو گیا - اب اس دوسرے شخص نے
کار سے نیچے اُتر کر کار کو دھکیلا اور کھائی میں
گرا دیا - فاخر کے گھر والوں سے جب بات چیت
کی گئی تو انھوں نے ایک پُراسرار آدمی سے
فاخر کی چند ملاقاتوں کا حال بیان کیا، وہ
پُراسرار آدمی ان کے گھر آ کر ہی فاخر کریم سے
ملاقاتیں کرتا رہا تھا - گھر کے افراد نے اس آدمی
کا جو حلیہ بتایا - ایک ماہر پولیس آرٹسٹ کے
ذریعے اس کا خاکہ بنوایا گیا - اب وہ خاکہ اخبارات
میں شائع کرایا جا رہا ہے - شاید کوئی نتیجہ نکل
آئے - گھر کے افراد کا کہنا ہے کہ انھوں نے
ان تین چار ملاقاتوں سے پہلے کبھی اس شخص کو
نہیں دیکھا - فاخر کے دوستوں کو بھی چیک کیا گیا،
لیکن اس حلیے کا کوئی دوست نہیں نکلا - فاخر
کریم ایک انجنیئر تھا - عمارات اور سڑکیں بنوایا کرتا

تھا۔"
"عمارات اور سڑکیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔
"شاید ہماری تفتیش درست سمت میں جا رہی ہے۔" فرزانہ
نے کپکپاتی آواز میں کہا۔
"ہاں! ہم ابھی اور اسی وقت فاخر کے گھر چل رہے ہیں،
اگرچہ ہم وہاں جا کر ان لوگوں کا غم ہی تازہ کریں گے،
لیکن کیا کیا جائے - مجبوری ہے۔" انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔
اور وہ وہاں سے روانہ ہوئے - اکرام کو بھی انھوں
نے ساتھ لے لیا تھا - فاخر کریم کا بوڑھا باپ ان سے
خندہ پیشانی سے ملا:
"فرمائیے - میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"
"ہم ایک دکھ بھرا ذکر چھیڑنے لگے ہیں - ہمیں افسوس ہے۔"
"شاید آپ میرے بیٹے فاخر کے بارے میں بات کرنے
آئے ہیں۔" اس نے غمگین آواز میں کہا۔
"ہاں! آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔"
"کہیے - کیا بات ہے؟"
"جن دنوں یہ حادثہ ہوا - وہ پُراسرار آدمی صرف انھی
دنوں فاخر سے ملنے آتا رہا تھا یا اس سے پہلے بھی کبھی
ملاقات کے لیے آیا تھا۔"

"ہم نے تو انھی دنوں اسے دیکھا تھا۔"

"اچھا یہ بتایئے۔ حادثے سے پہلے آپ کے بیٹے نے کوئی چیز تعمیر کرائی تھی؟"

"اسے ایک ٹھیکا ملا تو تھا، لیکن اس نے ٹھیکے کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ اتنا ضرور کہا تھا کہ وہ ایک خفیہ ٹھیکا ہے۔"

"خفیہ ٹھیکا۔"

"ہاں! اس نے بس اتنا بتایا تھا کہ کچھ لوگ ایک کام خفیہ طور پر کرانا چاہتے ہیں۔ سارا کام ہی خفیہ طور پر کرنا ہو گا۔"

"لیکن جناب۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ آخر اس قسم کے کام مزدوروں سے کرائے جاتے ہیں۔ اور جو کام ان گنت مزدوروں سے کرایا جائے۔ بھلا وہ کس طرح خفیہ رہ سکتا ہے۔"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ۔ انھوں نے اس کام کو کس طرح خفیہ رکھا تھا۔" بوڑھے باپ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"ہوں! خیر۔ کوئی بات نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ کو کچھ معلوم نہیں۔ کہ وہ کیا کام تھا اور کہاں کیا جا رہا تھا۔"

"جی نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"شکریہ۔ میرا خیال ہے۔ اب بہت جلد آپ کے بیٹے کا قاتل پکڑا جائے گا۔"

"لیکن۔ یہ بات میرے لیے ذرا بھی خوشی کی نہیں ہو

گی، کیوں کہ اس طرح میرا بیٹا لوٹ کر نہیں آ جائے گا۔"

"ہاں! لیکن قاتل کو سزا بھی تو ملنی چاہیے۔ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! یہ تو ہے۔" اس نے کہا۔

اور وہ وہاں سے رخصت ہوئے۔ باہر آ کر انسپکٹر جمشید بولے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس جہاز کو اغوا کرنے کے لیے ملک میں کسی جگہ ایک عدد ایئر پورٹ بنایا گیا ہے، خفیہ ایئر پورٹ۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

ایک چیز

انسپکٹر زاہد نے انھیں حیرت بھری نظروں سے دیکھا ، پھر بولا :

" مجھے حیرت ہے۔ اتنی دیر بعد یہ معاملہ پھر سے شروع ہو رہا ہے۔ کم از کم میں تو اس پُراسرار آدمی کو تلاش نہیں کر سکا تھا۔ میرا خیال تھا۔ خاکہ درست نہیں بنایا جا سکا۔"

" جی نہیں۔ خاکہ بالکل درست بنا تھا۔ اور اسی خاکے کی مدد سے اسے نو ماہ کا عرصہ گزرنے کے بعد پہچانا گیا ہے۔"

" کمال ہے۔" وہ بولا ، پھر چونک کر کہا :

" کون ہے وہ ؟"

" ابھی یہ نہ پوچھیں۔ کیوں کہ معاملہ بہت گہرا ہے۔ اگر اس تفتیش کے دوران کوئی خاص بات پیش آئی ہو

تو وہ ضرور ہمیں بتا دیں۔"

" ہاں ! ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ اور وہ یہ کہ بہت ہی خفیہ انداز میں میری نگرانی ہو رہی تھی۔ کوئی سائے کی طرح میرا تعاقب کرتا رہتا تھا۔ کوشش کے باوجود میں جان نہ سکا کہ وہ کون ہے، وہ کوئی بہت ہی ماہر آدمی تھا۔ میں صرف اتنا احساس کر سکا کہ کوئی میری نگرانی کرتا رہتا ہے۔"

" ہوں۔ اور اگر آپ قاتل کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچ جاتے تو شاید آپ کی بھی لاش کسی کھڈ میں ملتی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

" ارے باپ رے۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

" آپ بچ اسی لیے گئے کہ تفتیش رک گئی تھی۔ آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔"

" ہاں جناب۔ بات تھی تو یہی۔ میں بری طرح ناکام ہو گیا تھا۔" اس نے اقرار کیا۔

" ہم بہت جلد فاخر کریم کے قاتل کو گرفتار کرنے والے ہیں، آپ کی بھی اس سے ملاقات کروائیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

" بہت بہت شکریہ۔"

"مرنے سے پہلے فاخر نے کوئی خفیہ تعمیر کروائی تھی۔ اس کے بارے میں تو آپ کچھ معلوم نہیں کر سکے تھے؟"

"جی نہیں۔ یہ بات تو مجھے آپ سے ہی معلوم ہوئی ہے۔" اس نے کہا۔

اور وہ وہاں سے بھی نکل آئے۔

"ابا جان! کیا یہ خفیہ کام راجا آباد کے ایر پورٹ کی مرمت تھا؟" فاروق نے پوچھا۔

"اس کا بھی امکان ہو سکتا ہے، لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ کوئی نیا ایر پورٹ بنوایا گیا ہے، کیوں کہ راجا آباد والے ایر پورٹ کے بارے میں خیال قائم کیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ ہم کر چکے ہیں۔"

"پھر بھی۔ ہمیں اس ایر پورٹ کا جائزہ لے تو لینا چاہیے۔"

"ضرور کیوں نہیں۔ ہم یہ کام بھی کریں گے۔ پہلے میں اپنے ماتحتوں سے بات کر لوں۔"

انھوں نے ان ماتحتوں سے رابطہ قائم کیا جو فیاض منیر کی نگرانی کر رہے تھے:

"کیوں بھئی۔ کوئی بات معلوم ہوئی؟"

"جی نہیں۔ ابھی تک تو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔"

"اچھا خیر۔ میری ایک بات ذہن میں رکھنا۔ پوری ہوشیاری سے نگرانی جاری رہے۔ اس شخص کو نظروں سے اوجھل ہرگز نہ ہونے دینا۔ تم اس کی نظروں میں آتے ہو تو آجاؤ۔ وہ تمھاری طرف سے بے شک خبردار ہو جائے، لیکن وہ تمھاری نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔"

"بہت بہتر سر۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"دوسری بات یہ کہ یہ آدمی بہت خطرناک بھی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک خطرناک قاتل ہے۔"

"اوہ۔ اچھا۔" دوسری طرف سے حیران ہو کر کہا گیا۔

"ہاں! لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خوف زدہ ہو جاؤ۔" انسپکٹر جمشید ہنس کر بولے۔

"نہیں سر۔ خوف زدہ تو خیر، ہم نہیں ہوں گے۔"

"شکریہ۔" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"ہاں بھئی۔ کیوں نہ اب پہلے راجا آباد کا ایر پورٹ دیکھ لیا جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن ابا جان۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہیلی کاپٹر کے ذریعے اس ایر پورٹ کا جائزہ نہیں لیا گیا ہوگا۔" محمود نے کہا۔

"میں ابھی یہ بات معلوم کیے لیتا ہوں۔"

اُنھوں نے فون پر نمبر ملائے۔ اور پھر بات کرتے رہے،
آخر ریسیور رکھ کر بولے:

"ہیلی کاپٹر اس طرف بھی گئے ہیں، لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک جہاز کو ایئرپورٹ پر اس طرح چھپایا جا سکتا ہے کہ اُوپر سے نظر نہ آسکے۔"

"وُہ کیسے؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"اس کے کئی طریقے ہیں۔ جنگ کے دنوں میں اس قسم کے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔"

"ہُوں۔ تو پھر۔ اب ہمیں راجا آباد ہو ہی آنا چاہیے۔"

آخر وُہ روانہ ہو گئے۔ راجا آباد کار پر ہی جا سکتے تھے۔ اس غرض کے لیے خان رحمان کی بڑی کار لی گئی۔ کئی گھنٹے تک ان کا سفر بخیر و خوبی جاری رہا۔ پھر ریگستانی علاقہ شروع ہو گیا۔ چُوں کہ اس طرف اب آبادی نہیں رہی تھی۔ اس لیے۔ دُور دُور تک کسی انسان کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اچانک محمود کے مُنہ سے نکلا:

"مَیں۔ دُور۔ بہت دُور۔ سڑک پر ایک سیاہ دھبّہ دیکھ رہا ہُوں۔"

"دیکھ لو۔ اجازت ہے۔" فارُوق مسکرایا۔

"یہ سیاہ دھبّہ ہمارے لیے کوئی خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔"

محمود نے منہ بنایا۔

"ہم پیدا ہی خطرات کا سامنا کرنے کے لیے ہوئے ہیں۔" فارُوق نے منہ بنایا۔

"جب پیدا ہی اس لیے ہوئے ہو تو منہ بنانا کیسا؟" فرزانہ جل گئی۔

"اور تمھارا یہ جلنا بھننا کیسا؟" فارُوق مسکرایا۔

"دھبّہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ ارے ارے۔ خان رحمان روکو!" انسپکٹر جمشید چلائے۔

خان رحمان گڑبڑا گئے۔ انھوں نے یک دم بریک لگائے، لیکن اسی وقت ایک گولی کار کا ٹائر پھاڑ گئی۔ دُوسری شیشے پر لگی۔ انھوں نے اگر پہلے ہی اپنے آپ کو نیچے نہ جھکا دیا ہوتا تو ان میں سے ایک آدھ صاف تھا۔ گولی پچھلا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ اسی وقت تیسری گولی کار کے انجن میں لگی اور اس میں آگ لگ گئی۔

"جلدی باہر نکلو۔ لیکن جھکے جھکے۔ ذرا اونچے ہوئے نہیں۔ اور کسی گولی نے مزاج پوچھا نہیں۔ وُہ دھبّہ دراصل رائفل کی نال تھا۔ ایک بہت طاقت ور رائفل۔" انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔

انھوں نے جلدی جلدی دروازے کھول ڈالے اور

جھکے جھکے باہر نکل کر زمین پر لیٹ گئے، پھر کار کے
نیچے رینگ گئے۔ اب انسپکٹر جمشید نے اردگرد کا جائزہ
لیا۔ دونوں طرف ریگستان تھا۔ ریگستان کے درمیان میں
یہ سڑک چلی گئی تھی۔ نہ سبزہ۔ نہ آبادی۔ ادھر کار دھڑا دھڑ
جل رہی تھی۔ پٹرول کی ٹنکی تک آگ پہنچنے کی دیر تھی،
پھر کار ایک دھماکے سے اُڑ جاتی۔

"ہمیں جلد از جلد اس سے دُور ہو جانا چاہیے۔" انسپکٹر
جمشید بولے۔

اور وہ پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ فائرنگ ابھی تک ہو
رہی تھی اور گولیاں ان کے اُوپر سے، دائیں سے اور
بائیں سے گزر رہی تھیں۔ اچانک کان پھاڑ دینے والا
دھماکا ہوا اور کار کے پرخچے اڑ گئے۔ وہ بھی اس کے
ٹکڑوں کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہر ایک کو کوئی
نہ کوئی زخم آیا۔ زخموں سے خون بہنے لگا۔ ان میں شدید
جلن ہونے لگی۔ لیکن اس وقت مسئلہ تھا جان بچانے کا۔
وہ زخموں کی پروا کیے بغیر دُور ہوتے چلے گئے۔ اچانک دائیں
طرف ایک ریت کا ٹیلہ نظر آیا۔

"ان حالات میں یہ ٹیلہ ایک بہترین پناہ گاہ ثابت
ہو سکتا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"ہوں ٹھیک ہے۔"

اور وہ لڑھک کر اس ٹیلے کے پیچھے پہنچ گئے۔ اب
گولیاں ٹیلے پر آ کر لگنے لگیں، لیکن گولیاں ٹیلے میں سے
گزر کر ان تک نہ پہنچ سکیں۔ ٹیلہ بہت بڑا تھا۔

"جمشید۔ یہ ٹیلہ کب تک ہمیں پناہ دے سکتا ہے،
اگر وہ چکر کاٹ کر اس طرف آ گئے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اس صورت میں ہم ٹیلے کے دُوسری طرف ہو جائیں
گے۔" انھوں نے کہا۔

"افسوس! پستول کی گولی اتنی دُور نہیں جا سکتی۔ ورنہ
اس وقت تک ہم انھیں بے کار کر چکے ہوتے۔" فاروق
نے سرد آہ بھری۔

"میری ایک تجویز ہے جمشید۔ یہ ٹیلہ واقعی زیادہ دیر
ہمیں پناہ نہیں دے سکتا۔ ہو سکتا ہے۔ ان کے کچھ ساتھی
چکر کاٹ کر اس طرف سے آنے کی تیاری کر رہے
ہوں۔ اگر ان کے پاس بھی رائفلیں ہوئیں تو پھر ہم
نہایت آسانی سے بھون ڈالے جائیں گے۔ لہٰذا کیوں نہ ہم
پیچھے ہٹنے کا عمل جاری رکھیں۔ ان حالات میں پیچھے ہٹنے کا
عمل نہایت ضروری ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ بولے۔

اب اُنھوں نے ٹیلے کی سیدھ میں پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایسی جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے تھے۔

"بھئی واہ۔ یہ جگہ ہے ہمارے مطلب کی۔" خان رحمان چلّائے۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ یہاں ہم انھیں چکر دے سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مُسکرائے۔

اب انھوں نے بھی اپنے پستول نکال لیے۔ دائیں بائیں بھی نظریں دوڑانے لگے۔ بلکہ پچھلی طرف بھی۔ اچانک فائرنگ بند ہو گئی۔ ریگستان میں صرف ہوا کی سائیں سائیں سُنائی دینے لگی۔

"یار لوگ کوئی نیا پروگرام ترتیب دے رہے ہیں شاید۔" فاروق مسکرایا۔

"ہاں، ناکام جو ہو گئے ہیں۔" خان رحمان بولے۔

کافی دیر گزر گئی۔ نہ کوئی دشمن آتا نظر آیا۔ نہ کوئی فائر ہوا۔

"شاید یہ لوگ بھاگ لیے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"لیکن انھیں بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"انھوں نے سوچا ہوگا کہ اب ہم ریگستان میں ایڑیاں

رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔ اس طرف کوئی گاڑی تو آئے گی نہیں۔ آمد و رفت تو اس پر بالکل ختم ہے۔"

"اوہ! اور ہم اپنے شہر سے تقریباً چار سو کلومیٹر دُور ہیں۔"

"گویا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم پیدل شہر کی طرف چل پڑیں۔ اور راستے میں ہی بھوک اور پیاس سے مر جائیں، لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ ایسا نہیں ہوگا۔" انسپکٹر جمشید غرّائے۔

"لیکن ابّا جان۔ ہم ان حالات میں کر ہی کیا سکتے ہیں، اس وقت تو سُورج غروب ہونے والا ہے۔ چاندنی رات میں جب ریگستان میں جھکڑ چلیں گے تو بے حساب ریت ہم پر آ گرے گی۔ ہم کیا کریں گے۔" محمود نے کہا۔

"اللہ پر بھروسہ۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ ان حالات میں ہم اللہ پر بھروسہ کریں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے، پھر جلدی سے بولے:

"میری ایک تجویز ہے۔ کیوں نہ ہم دشمنوں کی امید کے بالکل اُلٹ کام کریں۔"

"جی۔ کیا مطلب؟"

"ان کا یہی خیال ہے نا کہ ہم یہاں سے شہر کا رُخ

کریں گے۔ اور کسی آبادی کے قریب پہنچتے ہی مدد حاصل کریں گے۔"

"جی ہاں!"

"لیکن ہم شہر کی طرف جانے کی بجائے راجا آباد کی طرف کیوں نہ چلیں۔ ان کے پاس ضرور کوئی گاڑی ہو گی۔ ہم اس گاڑی کو حاصل کر کے سفر کر سکتے ہیں۔ اس طرح ان کا منصوبہ فیل ہو جائے گا۔"

"ترکیب زور دار ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

"لیکن اس میں ایک خطرناک پہلو ہے۔ فرض کیا۔ ہم دشمنوں کو تلاش نہیں کر پاتے۔ تو اس صورت میں اپنا فاصلہ ضرور بڑھا لیں گے۔"

"کیا کیا جائے۔ یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ مجھے امید ہے۔ دشمن یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہو گا اور وُہ ہمارے جانے کا انتظار کرے گا۔ تاکہ خود بھی واپسی کا راستا اختیار کرے۔"

"واپسی کا کیوں۔ وُہ تو آگے جائیں گے۔ جہاز تو کہیں آگے ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ابھی ہم راجا آباد کہاں پہنچے۔ راجا آباد یہاں سے بہت فاصلے پر ہے۔ ان لوگوں نے تو قریباً درمیان میں

ہمیں روکا ہے۔"

"ٹھیک ہے جمشید۔ یُوں ہی سہی۔"

آخر وُہ آگے بڑھنے لگے، لیکن اس طرح کہ سڑک سے دُور نہ ہونے پائیں۔ اور ٹیلوں کی اوٹ لیتے ہوئے۔ سُورج غروب ہونے کے قریب نہ ہوتا تو دھوپ کی تیزی انھیں پریشان کر دیتی۔ ریگستان میں دھوپ کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ دُوسرے انھیں یہ فکر تھا کہ اگر وُہ رات ہونے سے پہلے دشمنوں تک نہ پہنچ سکے تو تاریکی میں وُہ کہاں بھٹکتے پھریں گے۔ چاند نکل آنے کی صُورت میں ضرور آگے بڑھ سکتے تھے، لیکن چاند بھی فوراً ہی تو نکل نہ آتا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ آج چاند کی سات یا آٹھ تاریخ ہے۔ گویا چاند کی روشنی ہمارے کام آ سکے گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اللہ کرے ہم اس سے پہلے ہی ان تک پہنچ جائیں۔"

"آمین!"

ان کا سفر جاری رہا۔ آخر انھوں نے ایک جگہ ایک گاڑی کی جھلک دیکھی۔ وُہ ٹھٹک گئے۔ گاڑی کے آس پاس چھے آدمی موجود تھے۔ اور ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

"مار لیا میدان۔ اگر ہم نے انھیں اپنی موجودگی کا

احساس نہ ہونے دیا اور ان کے نزدیک پہنچ گئے تو یہ ہمارے نشانے پر ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی۔

"ہماری سرگوشی بھی ان تک پہنچ سکتی ہے جمشید۔ یہ ریگستان کی ہوائیں۔ بڑی شریر ہوتی ہیں۔" خان رحمان نے ان کے کان میں کہا۔

"ہوں۔" وہ بولے۔

اب وہ سب سینے کے بل رینگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ اور پھر جوں ہی دشمن ان کی زد میں آئے، انھوں نے پوری احتیاط سے فائر کر ڈالے۔ وہ چاہتے تھے۔ دشمن ذرا بھی رکاوٹ پیدا کرنے کے قابل نہ رہ جائے۔ دشمنوں کی چیخوں نے ریگستان کے سناٹے کو تار تار کر دیا۔ وہ ریت پر گر کر تڑپنے لگے۔ انھوں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی اور دشمن نظر نہ آیا۔ اب وہ اور آگے بڑھے، اس جگہ پہنچے جہاں دشمن پڑے تڑپ رہے تھے۔ ان میں سے دو زندہ تھے۔ باقی دم توڑ چکے تھے۔ وہ بھی شدید زخمی تھے، لیکن ان کے مرنے کے ابھی آثار نہیں تھے۔

"تم کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ جہاز کہاں ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہم۔ ہم۔" ایک ہکلایا۔

"ہاں۔ تم لوگوں کو کس نے ہم پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا؟"

"اس نے۔" ایک نے ایک مُردہ ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کون ہے؟"

"گمی۔ یہ ہمارا استاد تھا۔ اسی نے ہمیں اس راستے پر ڈالا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم۔ یہ کہاں سے حکم حاصل کرتا تھا۔ یا اس کا کیا طریقہ کار تھا۔ ہمیں تو یہ بس حکم دے دیتا تھا اور مہینے کے بعد تنخواہ مل جاتی تھی۔ اور ہمیں کچھ نہیں معلوم۔"

"تت۔ تو کیا تم کرائے کے قاتل ہو؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! یہی بات ہے۔ ہم کرائے کے قاتل ہی ہیں۔" دوسرا بولا۔

"گمی کا ٹھکانا کہاں ہے۔ بتا سکتے ہو۔"

"ہاں! یہ ۱۰۹ شاتی روڈ پر رہتا تھا دارالحکومت میں۔"

"اور تم لوگ؟"

"ہم بھی وہیں اس کے ساتھ رہتے تھے۔"

"میرا مطلب ہے۔ تم لوگوں کے اپنے گھر کہاں ہیں۔"

"ہمارے گھر کہاں ہو سکتے ہیں۔ گھروں سے تو ہم بچپن میں بھاگ آئے تھے۔ بچپن میں آوارہ دوستوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ ان کے مشورے پر گھر سے بھاگ نکلے، اور پھر زندگی بھر گھر واپس نہ جا سکے۔ جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے کہاں کے کہاں پہنچ گئے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے گھر تھے کہاں۔" اس نے حسرت زدہ انداز میں کہا۔

"یہ گاڑی گمّی کی اپنی گاڑی ہے؟"

"ہاں! گمّی بہت مشہور آدمی تھا۔ پولیس کبھی اسے گرفتار نہیں کر سکی۔ کوئی افسر اس کے خلاف ثبوت حاصل کر بھی لیتا تو یہ اس کی جیب گرم کر دیتا تھا۔ اور وہ سلام کرتے ہوئے رُخصت ہو جاتا۔" اس نے بتایا۔

"خان رحمان۔ ان کے زخموں پر پٹیاں باندھ دینی چاہییں۔ ہم انھیں شہر لے چلیں گے۔ شاید یہ بچ جائیں۔"

"کیا فائدہ۔ بچنے کے بعد بھی تو جیل میں رہنا ہوگا۔ پھانسی پر چڑھنا ہوگا۔ آپ ہمیں مر ہی جانے دیں۔"

"نہیں بھئی۔ قانون کے تقاضے پورے ہونے چاہییں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں نہیں۔ ہمیں اور مصیبت میں نہ ڈالیں۔ ایک ایک

گولی ہمارے دماغوں میں اُتار دیں۔"

"افسوس! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ اچھا یہ بتاؤ۔ جہاز کہاں ہے؟"

"جہاز۔ کون سا جہاز۔ کیسا جہاز۔" دوسرا حیران ہو کر بولا۔

"چلو یہ سہی۔ اگر تم جہاز کے بارے میں بتا دو گے۔ تو ہم تمھیں مرنے کے لیے چھوڑ جائیں گے۔"

"افسوس! ہم نہیں جانتے، آپ کس جہاز کی بات کر رہے ہیں۔"

انھوں نے محسوس کر لیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ اب ان سے بحث فضول تھی۔ آخر انھوں نے واپسی کی ٹھانی، کیوں کہ اس گاڑی میں پٹرول زیادہ نہیں تھا۔ اگر وہ راجا آباد تک جاتے تو واپسی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔

دونوں زخمیوں کو گاڑی میں لادنے سے پہلے انھوں نے گمّی اور دوسرے مرنے والوں کی تلاشی لی، لیکن کوئی کام کی چیز نہ ملی۔ آخر وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ہی ان دونوں نے بھی دم توڑ دیا۔

"بے چارے۔ دُنیا کے غموں سے چھٹی پا گئے۔ ان کی زندگی بھی کیا تھی۔ بچپن میں گھر سے نکل گئے تھے، پھر

زندگی بھر اپنے ماں باپ کی صورت نہ دیکھ سکے۔ ماں باپ
کا ان کے غم میں نہ جانے کیا حال ہوا ہوگا۔ افسوس۔"
"بُری صحبت کا انجام بھی بُرا۔" فاروق بڑبڑایا۔
شہر پہنچ کر انھوں نے فوراً ہی پھر راجا آباد کا رُخ کیا،
وہ چاہتے تھے۔ دشمنوں کو ان کے بارے میں ابھی کچھ معلوم
نہ ہو۔ یعنی ان کے بھیجے ہوئے کرائے کے قاتلوں نے
انھیں ٹھکانے لگا دیا یا نہیں۔ اس مرتبہ ان کے راستے
میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی اور وہ راجا آباد ایرپورٹ کے
قریب پہنچ گئے؛ تاہم اندھا دھند آگے نہیں بڑھے، کچھ
فاصلے پر گاڑی سے اُترے اور پھر احتیاط سے آگے بڑھے،
دُور دُور تک درخت یا کسی عمارت کا کوئی نام و نشان
نہیں تھا۔ وہ بس اتنی احتیاط کر سکتے تھے کہ جھکے جھکے
آگے بڑھتے رہے۔ آخر ایرپورٹ کی حدود میں داخل ہو
گئے، لیکن دُور دُور تک انھیں کوئی جہاز یا کوئی انسان نظر
نہ آیا؛
"یہاں تو کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا۔" محمود بڑبڑایا۔
"اس بات کو چھوڑو۔ دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ ایرپورٹ
کے گڑھوں کو پُر کیا گیا ہے یا نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
"اوہ ہاں۔ یہ بات ٹھیک ہے۔" خان رحمان جلدی سے

بولے۔
"لیکن جمشید۔ ہم پیدل کب تک جائزہ لیں گے۔ یہاں
کوئی نظر تو آ نہیں رہا۔ کیوں نہ ہم گاڑی میں بیٹھ کر جائزہ
لے لیں۔" پروفیسر داؤد نے پریشان ہو کر کہا۔
"جی ہاں۔ یہی کرتے ہیں۔" وہ بولے اور پھر خان رحمان
گاڑی لینے چلے گئے۔ انھوں نے اپنا معائنہ جاری رکھا۔
پھر گاڑی آ گئی۔ اس میں بیٹھ کر سارے ایرپورٹ کا
جائزہ لیا گیا۔ کہیں بھی کوئی گڑھا نظر نہ آیا۔
"کیا یہ بات عجیب نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
"یہ تو عجیب سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔" فاروق مسکرایا۔
"ہاں! گڑھے پُر کیے گئے ہیں۔ ان پر باقاعدہ روڑی
بچھا کر پختہ کیا گیا ہے۔ گویا جہاز کو اُتارنے کا پورا پورا
انتظام کیا گیا ہے، لیکن اس سے زیادہ حیران کُن بات
یہ ہے کہ جہاز کہیں نظر نہیں آ رہا۔ آخر جہاز کہاں
ہے۔ وہ کوئی ننھا سا کھلونا تو ہے نہیں جسے کہیں چھپا
دیا جائے۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔
"معاملہ اب اور اُلجھ گیا ہے۔" محمود نے کہا۔
"سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟"
"ایرپورٹ کا ایک چکر باریک بینی سے اور لگایا جائے

اور پھر واپس شہر چلا جائے۔ اس سازش کا سُراغ شہر میں
ہی لگ سکے گا۔" فرزانہ نے مشورہ دیا۔

"منظور۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

اُنھوں نے پورے ایر پورٹ کی سڑکوں کا پھر سے بغور
جائزہ لیا۔ اور پھر اچانک فاروق بول اُٹھا:

"رک جائیے انکل۔ مجھے ایک چیز نظر آئی ہے۔"

خان رحمان نے چونک کر گاڑی روک دی، پھر انھیں
گاڑی کچھ پیچھے لے جانا پڑی۔

"بس۔ یہیں روک دیجیے۔" فاروق نے کہا اور گاڑی رُکنے
سے پہلے ہی نیچے چھلانگ لگا دی۔

انھوں نے اسے جھک کر کوئی چیز اُٹھاتے دیکھا۔
وہ واپس آیا تو چہرے پر ایک فاتحانہ مُسکراہٹ تھی، ہاتھ
میں ایک پلاسٹک کا ننھا سا تھیلا تھا۔ جس کا ایک سرا
چاک کیا ہوا تھا۔ اس تھیلے میں کوئی چیز نہیں تھی۔

"دھت تیرے کی۔ یہ اس نے چیز اُٹھائی ہے۔" محمود نے
جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"فاروق۔ ہمیں یہ امید نہیں تھی کہ تم ان حالات میں
بھی مذاق کرو گے۔" فرزانہ نے بھی اسے گھورا۔

"آپ کا کیا خیال ہے، ابا جان۔ کیا میں نے کوئی مذاق

کیا ہے۔" فاروق بولا۔

"نہیں بھئی۔ مذاق تو تم نے نہیں کیا۔" وہ بولے۔

"لیکن ابا جان۔ بھلا یہ چیز بھی کوئی کام کی چیز ہے۔"
فرزانہ جلدی سے بولی۔

"یہ تم فاروق سے پوچھو، کیوں کہ میرے خیال میں
بھی یہ کوئی کام کی چیز نہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جب کہ میرے خیال میں یہ چیز بہت اہم ہے۔"
پروفیسر داؤد بول پڑے۔

"جی۔ کیا فرمایا آپ نے۔" محمود ان کی طرف مڑا۔

"اور میں مذاق کے موڈ میں بھی نہیں ہوں۔" وہ
بولے۔

"شکریہ انکل۔ آپ نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔" فاروق
نے چہک کر کہا۔

"تت۔ تو۔ تو کیا تمھارا حوصلہ گھٹ رہا تھا۔" فرزانہ کے
لہجے میں حیرت تھی۔

"میں پریشان ضرور ہو گیا تھا، کیوں کہ کوئی بھی
اس چیز کو اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔" فاروق نے
کہا۔

"تو پھر۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم اپنا خیال ظاہر

کر سکتے تھے۔"

"لیکن اب میں اور زیادہ اعتماد سے خیال ظاہر کروں گا۔" فاروق بولا۔

"ہوں — ٹھیک ہے بابا — اب خیال ظاہر کرو بھی۔" فرزانہ نے بھنّا کر کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ ایر پورٹ کے گڑھے پُر کر دیے گئے ہیں — صاف ظاہر ہے — یہ کام کچھ انسانوں نے ہی کیا ہے — ایر پورٹ کی بالکل صاف سڑکوں سے ظاہر ہے کہ کسی سے اگر کوئی چیز یہاں گری بھی تھی تو پوری احتیاط سے اسے اُٹھا لیا گیا — تاکہ کوئی یہ خیال نہ کر سکے کہ جہاز کو یہیں اُتارا گیا ہے۔"

"ابھی تک تم نے اس پلاسٹک بیگ کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔" محمود نے بُرا سا منہ بنایا۔

"میں اب اس طرف آ رہا ہوں — فکر نہ کرو — انھوں نے سب چیزیں تو اُٹھا لیں، لیکن اس پلاسٹک بیگ پر اگر کسی کی نظر بھی پڑی تو اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی — اور یہی چیز ہمارے کام آئے گی، ان شاء اللہ۔" فاروق نے شوخ انداز میں کہا۔

"اب زیادہ سسپنس بگھارنے کی کوشش نہ کرو۔" فرزانہ تڑ

سے بولی۔

"بہت اچھا — یہ کام تم کر لینا — میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ پلاسٹک بیگ۔۔۔"

"ایک منٹ بھئی۔" انسپکٹر جمشید بول اُٹھے۔

وہ چونک کر ان کی طرف مُڑے:

"کیا ہوا ابّا جان؟" فاروق نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں دراصل تمھاری تعریف کرنا چاہتا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ابّا جان، کیوں کہ تعریف تو بس اللہ کی ہی کرنی چاہیے — جیسا کہ سورۂ فاتحہ کا پہلا جملہ — اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ — سب تعریفیں اسی اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔"

"ہاں واقعی یہ بات تو ٹھیک ہے — لیکن بھئی — یہ تعریف اور معنوں میں ہے — دُنیا میں کوئی شخص اگر کوئی اچھا کام کر کے دکھاتا ہے تو لوگ اس کی تعریف کرتے ہی ہیں — اس سے اس کا حوصلہ بلند ہوتا ہے، خیر — میں صرف یہ کہوں گا کہ تم نے واقعی ایک بہت کام کی چیز اُٹھائی — یہ ہولناک منصوبہ بنانے والے جس چیز کو نظر انداز کر گئے، اس کی طرف تم نے توجہ دے

ڈالی۔"

"لیکن ابّا جان - ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ بھی نہیں سمجھ سکے کہ یہ چیز کام کی کس طرح ہے۔"

"اس وقت کہا تھا - اب میں سمجھ چکا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہو اچھا - اب تو ہم سب کو ہی ماننا پڑے گا۔" محمود بوکھلا کر بولا۔

"نہیں نہیں - اب بھی نہ مانو۔" فاروق نے منہ بنایا اور وہ مسکرا دیے۔

"بھئی میں نے پہلے ہی بات تسلیم کر لی تھی۔" پروفیسر داؤد نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن کیسے انکل - آپ نے کیسے جان لیا تھا؟"

"میرے کچھ دوست ہیں - جو یہ چیز استعمال کرتے ہیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اب آپ بھی فاروق کے ساتھ ہماری بے چینی میں اضافہ کرنے پر تُل گئے ہیں انکل۔" فرزانہ نے شکایت آمیز انداز میں کہا۔

"اوہ - معاف کرنا بیٹی - چلو فاروق - تم اپنا کام کرو - بتا دو انہیں۔"

"یہ پلاسٹک بیگ دراصل کسی پائپ پینے والے کا ہے - اس میں غیر ملکی تمباکو ہوتا ہے۔"

"اوہ!" محمود، فرزانہ اور خان رحمان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

پروفیسر داؤد اور انسپکٹر جمشید کے چہروں پر مسکراہٹ تیر گئی۔

اس کی کار

چند لمحے خاموشی میں گزرے، پھر محمود نے کہا:

" اس کا مطلب ہے۔ جہاز اسی جگہ اُتارا گیا ہے۔"

" ہاں! اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔"

" لیکن جہاز کہاں ہے، اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔"

" ہو سکتا ہے۔ یہ بیگ مدتوں پہلے یہاں کسی نے گرایا ہو۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

" اس میں سے تمباکو کی ہلکی سی خوشبو آ رہی ہے، لہٰذا یہ ایک آدھ دن پہلے ہی یہاں گرا ہے۔"

" تب پھر۔ ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ جہاز کو اغوا کرنے والوں میں یا جہاز میں سفر کرنے والوں میں سے کوئی شخص ایسا ضرور ہے۔ جو پائپ پینے کا عادی ہے۔" خان رحمان بولے۔

" جی ہاں انکل۔ بالکل یہی بات ہے۔" فاروق نے کہا۔

" اب ہمیں یہاں ماہرین کو لے کر آنا پڑے گا۔ وہ آلات کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ جہاز یہاں اُتارا گیا ہے یا نہیں اور اگر اُتارا گیا ہے تو وہ ہے کہاں، دوسری طرف ہم جہاز کے عملے کے گھروں سے یہ معلوم کریں گے کہ ان میں سے کوئی پائپ پینے کا عادی تو نہیں، یہ مسافروں کے عزیزوں سے بھی معلوم کریں گے۔"

" اس کا مطلب ہے۔ ابھی ہمیں بہت محنت کرنا ہو گی۔" فاروق بولا۔

" اور تم محنت سے جی چرانے والے ٹھہرے۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

" یہ سراسر الزام ہے۔ میرا خیال ہے۔ اب ہمیں یہاں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

اور وہ شہر پہنچ گئے۔ وہاں سے ماہرین کی ایک ٹیم راجا آباد ایرپورٹ کی طرف روانہ کر دی گئی۔ انسپکٹر جمشید نے گھر پہنچتے ہی فون کا ریسیور سنبھال لیا۔ سب سے پہلے انھوں نے سرخاب غوری کو فون کیا:

" ہیلو سر۔ معاف کیجیے گا، آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ جی۔ اوہ ہاں۔ میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں، میں انسپکٹر جمشید ہوں۔ شکریہ جناب۔ کیا آپ کے بیٹے کاشف

غوری صاحب پائپ پینے کے عادی ہیں؟"

"پائپ۔ آپ کا مطلب ہے۔ جس میں تماکو سلگا کر پیا جاتا ہے؟"

"جی ہاں! وہی۔"

"نہیں جناب۔ میرا بیٹا تمباکو نوشی نہیں کرتا۔ کسی بھی قسم کی۔"

"شکریہ جناب۔ مجھے بس یہی معلوم کرنا تھا۔"

"لیکن آپ نے یہ بات کیوں پوچھی؟" سرخاب غوری کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہم ابھی ابھی راجا آباد ایرپورٹ سے آ رہے ہیں، وہاں سڑک پر تمباکو کی ایک خالی تھیلی ملی ہے۔"

"اوہ!" سرخاب غوری کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

"کیا آپ اس جہاز کے عملے میں سے کسی ایسے آدمی کو جانتے ہیں جو پائپ پیتا ہو؟"

"جی نہیں۔ میں نہیں جانتا۔"

سلسلہ کاٹ کر انھوں نے اختر کاشوکی کے گھر فون کیا۔ دوسری طرف سے فوراً اختر کے والد نے جواب دیا۔

"آپ کے فرزند اختر کاشوکی تمباکو نوشی کرتے ہیں؟"

"جی ہاں! اس میں یہ گندی عادت ہے۔" دوسری طرف

سے کہا گیا۔

"وہ کیا چیز پیتے ہیں"؟ انھوں نے پوچھا۔

"جی۔ میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"صرف یہ کہ وہ سگریٹ پیتے ہیں یا پائپ؟"

"سگریٹ۔" اس نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔ مجھے بس یہی معلوم کرنا تھا۔" یہ کہ کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔

انھوں نے باقی عملے کے گھروں میں بھی فون کر کے معلومات حاصل کیں، لیکن کوئی بھی پائپ پینے والا نہ نکلا:

"اس کا مطلب ہے۔ جہاز کے مسافروں میں سے کوئی پائپ پیتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"لیکن ابا جان۔ جہاز پر تو ساڑھے چار سو کے قریب مسافر موجود تھے۔ آپ کس کس کو فون کریں گے۔" فاروق بولا۔

"سبھی کے گھر والوں کو۔"

"تو پھر اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم سب ایک ایک فون سنبھال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور مسافروں کے نام آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں تاکہ جلدی ہو جائے۔" فرزانہ نے تجویز پیش کی۔

"ترکیب اچھی ہے، لیکن ہمارے گھر میں صرف دو فون ہیں۔"

"دو یہاں ہیں — ایک آنٹی شیرازی کے ہاں موجود ہے۔ انکل خان رحمان اور پروفیسر انکل کے ہاں بھی دو دو فون موجود ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے — کام چل جائے گا۔"

اب اس ترکیب پر عمل شروع ہوا — آخر ایک گھنٹے کے بعد محمود کو ایک نام پائپ پینے والا مل گیا — اس نے فوراً اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی —

جلد ہی سب پھر ایک جگہ جمع ہو گئے —

"ہاں محمود — کیا نام ہے ان صاحب کا؟" انسپکٹر جمشید بولے —

"پروفیسر باقر خان۔"

وہ اسی وقت پروفیسر باقر خان کے گھر پہنچے — ان کے بیٹے نے ان کا استقبال کیا — ایک شان دار ڈرائنگ روم میں انھیں بٹھایا — لیکن گھر کی فضا پر غم طاری تھا —

"آپ لوگوں کو جہاز اغوا کرنے والوں کی طرف سے کوئی فون تو موصول نہیں ہوا؟"

"جی ہاں! موصول ہو چکا ہے — ایک کروڑ روپے جمع کرانے کا حکم ملا ہے۔" اس نے اداس انداز میں کہا۔

"پھر آپ لوگوں نے کیا پروگرام بنایا ہے؟"

"ہم نے افسران کو اطلاع دے دی ہے — جو وہ کہیں گے، ہم کریں گے۔"

"بہت اچھی بات ہے — اچھا آپ نے فون پر بتایا تھا کہ آپ کے والد صاحب پائپ پینے کے عادی ہیں۔"

"ہاں! یہی بات ہے۔" اس نے کہا۔

"تمباکو کا کوئی پیکٹ ہو گا آپ کے گھر میں۔"

"جی ہاں! کیوں نہیں — وہ گھر میں بہت سے پیکٹ رکھتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"آپ کا مطلب ہے — مختلف قسم کے تمباکوؤں کے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں — ایک ہی قسم کے بہت سے پیکٹ۔"

"مہربانی فرما کر ایک پیکٹ ہمیں دکھا دیں۔"

"جی بہتر!" اس نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا — جلد ہی وہ اندر داخل ہوا — اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا بیگ تھا — اس نے بیگ ان کے سامنے رکھ دیا — انھوں نے دیکھا — وہ بالکل ویسا ہی پیکٹ تھا — سونگھ کر دیکھنے پر بھی کوئی فرق نظر نہیں آیا — پھر انسپکٹر جمشید نے جیب سے پلاسٹک بیگ نکال کر اس کے برابر رکھ دیا — اور پروفیسر باقر کا بیٹا حیرت زدہ نظر آنے لگا:

"یہ کیا - یہ آپ کو کہاں سے ملا؟"

"ایک جگہ سے - اور ہمارا خیال ہے کہ جہاز کو اغوا کر کے وہیں لے جایا گیا ہے۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا -

★

اسے حیرت زدہ چھوڑ کر وہ باہر نکل آئے -

"اب ہمیں ماہرین کی ٹیم کی رپورٹ کا انتظار کرنا پڑے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے -

"میں اب تک حیران ہوں - اگر جہاز کو اس ایرپورٹ پر اُتارا گیا ہے تو اسے چھپایا کہاں گیا - ملک کے اس حصے کو بھی آخر ہیلی کاپٹروں کے ذریعے دیکھا گیا ہے - ہم بھی ایرپورٹ کو دیکھ چکے ہیں، لیکن جہاز کہاں ہے؟"

"صرف جہاز ہی نہیں - ساڑھے چار سو مسافر کہاں ہیں؟" فرزانہ بولی -

"ہاں واقعی - آخر اتنے بہت سے آدمیوں کو کہاں رکھا گیا ہے - انھیں کھلانا پلانا بھی پڑتا ہو گا - ان کی دوسری ضروریات کا بھی مسئلہ ہو گا۔"

"حد درجے اُلجھن محسوس ہو رہی ہے مجھے تو۔" پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا -

"ہم بھی بہت اُلجھن محسوس کر رہے ہیں انکل - لیکن کر ہی کیا سکتے ہیں۔" محمود بولا -

"بس - اُلجھن محسوس کرتے رہو - یہی بہت ہے۔" فاروق نے مسکرا کر کہا -

وہ گھر پہنچ گئے - انسپکٹر جمشید فون پر ڈٹ گئے - جلد ہی انھوں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا:

"لو بھئی - ماہرین کی ٹیم کا فیصلہ معلوم ہو گیا - ان کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایرپورٹ کی سڑکوں کی مرمت کی گئی ہے، لیکن ایرپورٹ پر کوئی جہاز موجود نہیں ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ جہاز اُتارا گیا ہے یا نہیں؟"

"سڑکوں سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اُتارا بھی گیا ہے یا نہیں - لیکن اس بات پر ان کا فیصلہ مضبوط ہے کہ وہاں کوئی جہاز موجود نہیں ہے۔"

"اُف مالک - تب پھر جہاز کہاں ہے؟"

"یہ شاید اس وقت کا سب سے خوفناک سوال ہے - ارے۔" فاروق نے کہا، پھر خود ہی چونک بھی اُٹھا -

"چونکے کس بات پر" محمود نے منہ بنایا۔

"اس۔ اسی پر۔ یعنی۔ خوف ناک سوال پر۔"

"چونکتے رہو بھئی۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" فرزانہ جل کر بولی۔

"تو تم بھی جلتی رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"جلتی ہے میری جوتی۔"

"یار جمشید۔ ایک خیال مجھے بھی آیا ہے۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"ارے تو بتاؤ نا۔"

"ہم نے دوبارہ زوبی منیر کے بھائی فیاض منیر کی طرف توجہ نہیں دی۔ جب کہ ہم جان چکے ہیں کہ وہ اس انجنیئر کا قاتل ہو سکتا ہے۔"

"وہ میرے ذہن میں ہے۔ اور اس کی نگرانی بھی ہو رہی ہے، لیکن چوں کہ نگرانی کرنے والوں کی طرف سے کوئی رپورٹ نہیں ملی۔ لہٰذا اس کا ایک ہی مطلب ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ یا تو گھر سے ہی نہیں نکلا، یا پھر کسی خاص جگہ نہیں گیا۔ ہو سکتا ہے۔ ہم سے ملاقات کے بعد وہ محتاط ہو گیا ہو۔"

"مجھے بھی اس سلسلے میں خیال سوجھا ہے۔" خان رحمان شوخ انداز میں مسکرائے۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کیوں نہ ہم جا کر اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہمیں اس پر انجنیئر کے قاتل ہونے کا شک ہو گیا ہے۔ بس ہم اتنی ہی بات کر کے آ جائیں۔ اسے گرفتار نہ کریں۔ مجھے یقین ہے۔ وہ گھبرا جائے گا۔ اور کوئی ایسی حرکت ضرور کر بیٹھے گا۔ جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

"بہت خوب! انکل آپ تو جاسوس ہوتے جا رہے ہیں۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"وہ آپ نے سنا نہیں محمود۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔"

"اوہ ہاں۔ واقعی۔ تو۔ تو آپ نے دراصل رنگ پکڑ لیا ہے۔" فاروق بولا۔

اور خان رحمان نے اس کی کمر پر ایک دھول رسید کر دی، لیکن لگی وہ محمود کو، کیوں کہ فاروق تو یک دم جھک گیا تھا۔

"بری بات ہے۔ بزرگوں کی دھول کھا لینی چاہیے۔" فرزانہ

نے فاروق کو گھورا۔

"تم کیوں نہیں کھا لیتیں۔"

"جب انکل مجھے دھول لگائیں گے تو ضرور کھاؤں گی۔
اس وقت تو باری تمھاری تھی۔" فرزانہ مسکرائی۔

"ہم خان رحمان کی ترکیب پر ضرور عمل کریں گے اور
اسی وقت کریں گے۔" انسپکٹر جمشید نے گویا اعلان کیا۔

وہ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ فیاض منیر نے انھیں
حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ بلکہ حیرت میں قدرے خوف
کی جھلک بھی نظر آئی:

"اوہو۔ آپ لوگ پھر آ گئے۔"

"جی ہاں! آپ سے چند ایک باتیں کریں گے۔ امید ہے،
آپ محسوس نہیں کریں گے۔"

"ضرور جناب۔ اس میں محسوس کرنے کی کیا بات ہے۔"
وہ بولا۔

وہ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

"نو ماہ پہلے ایک انجنیئر کو قتل کیا گیا تھا۔" انسپکٹر جمشید
یہاں تک کہہ کر رک گئے۔

"پھر۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"اس انجنیئر کے ساتھ ایک نوجوان کو کئی بار اس کے

گھر والوں نے دیکھا تھا، لیکن اس کے گھر والے اس
آدمی کو نہیں جانتے تھے۔ اور نہ انجنیئر نے اس کے بارے
میں گھر والوں کو کچھ بتایا۔ قتل کے بعد اس کے گھر
والوں نے پولیس کو اس نوجوان آدمی کے بارے میں
بتایا۔ پولیس نے اس کا حلیہ نوٹ کیا۔ اور خاکہ بنانے
کے ماہر کو وہ حلیہ دے دیا گیا۔ اس نے اپنے فن کے
زور پر ایک خاکہ بنایا۔ پولیس اس سے ملتے جلتے آدمی
کی تلاش میں آج تک ہے۔" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید
خاموش ہو گئے۔

فیاض منیر چند لمحے تک تو ان کی طرف دیکھتا رہا، پھر
بولا:

"سوال یہ ہے کہ آپ یہ ساری تفصیل مجھے کیوں سنا
رہے ہیں؟"

"پہلے آپ اس خاکے کو دیکھ لیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے
ایک لفافے میں سے خاکہ نکالا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔
خاکے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار
ہو گئے۔

"کیا خیال ہے۔ آپ اس شخص کو پہچانتے ہیں؟"

"نن۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"لیکن ہمیں اس خاکے میں اور آپ کے چہرے میں بہت زیادہ مشابہت نظر آ رہی ہے۔"

"کسی آرٹسٹ کے بنائے ہوئے خاکے کی بنا پر کیا آپ کسی شخص کو پھانسی پر چڑھا سکتے ہیں؟"

"صرف اتنی بات پر تو خیر نہیں، لیکن اس شخص کو تفتیش میں شامل تو کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر تفتیش اس خاکے کی تصدیق کرے تو پھر اس کے قاتل ہونے میں کیا شک رہ جائے گا۔"

"بہر حال۔ میں نے کوئی قتل نہیں کیا اور نہ اس خاکے سے میرا کوئی تعلق ہے۔ اور کوئی حکم؟"

"خیر۔ ہم مزید تحقیقات کر رہے ہیں۔ اور ان شاء اللہ بہت جلد کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔"

"جب آپ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں تو مجھے بھی اطلاع دیجیے گا۔" اس نے بظاہر مسکرا کر کہا۔ اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بہت بہت شکریہ جناب۔"

باہر نکل کر انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر دایاں ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ اب وہ اس کوٹھی سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئے۔ جلد ہی دو سادہ لباس والے

ان کے قریب آ گئے۔

"کیوں بھئی۔ خیر تو ہے۔ تم نے اس کے بارے میں کوئی رپورٹ، نہیں دی۔"

"جی سر۔ رپورٹ کیا دیتے۔ یہ کہیں گیا ہی نہیں۔"

"ہوں۔ خیر۔ اب تیار ہو جاؤ۔ اور پوری احتیاط سے اس کی نگرانی کرو۔ اب یہ گھر سے ضرور نکلے گا۔ دیکھو، اگر یہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پھر ہم بہت بڑی مشکل سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ میں تمھاری مدد کے لیے نمبر ۲ اور ۸ کو بھیج رہا ہوں۔ تم میں سے دو ہر وقت گاڑی پر تیار بیٹھے رہیں گے۔"

"او کے سر۔ آپ بے فکر رہیں۔ یہ ہماری نظروں سے بچ کر کہیں نہیں جا سکے گا۔"

"شکریہ۔" انھوں نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف آ گئے۔

"مجھے ایک اور خیال آیا ہے۔ اب ہم اس پہلو پر غور کریں گے۔ اور اس سلسلے میں چند سوال سرخاب غوری سے کریں گے، کیوں کہ وہ اس میدان کے ماہر ہیں۔"

"تو پھر چلیے۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

وہ سرخاب غوری کے گھر آئے۔ اس نے بھی حیرت کا

اظہار کیا۔ ڈرائنگ روم میں اطمینان سے بیٹھنے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے:

"ہم راجا آباد کے ایر پورٹ کا جائزہ لے چکے ہیں، اگرچہ اس قسم کے آثار ملے ہیں کہ جہاز وہاں اُتارا گیا ہے، لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ وہاں کوئی جہاز موجود نہیں ہے۔ ان حالات میں ہم کس قدر پریشان ہو سکتے ہیں۔ یہ آپ اندازہ لگا ہی سکتے ہیں۔ لہٰذا میں آپ سے ایک عدد مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"فرمائیے۔ میں ہر طرح تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

"ہمارے مُلک میں کوئی ایسی جگہ۔ آپ کے علم میں ہے۔ جہاں ایک عدد ایر پورٹ بنایا جا سکے۔"

"یہ۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں مُجرموں نے ایک عدد ایر پورٹ بنایا ہوگا۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں! اس کے علاوہ ہم کیا سوچ سکتے ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن۔ یہ کس طرح ممکن ہے۔ ذرا سوچیں۔ ایک پورا ایر پورٹ تعمیر کرنا آسان تو نہیں۔"

"جو لوگ ایسے کام کرتے ہیں۔ وُہ بھی تو زبردست صلاحیتوں کے ماہر ہوتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں اگر کوئی

جگہ ہو تو بتا دیں۔"

"نہیں! میں تو ایسی کسی جگہ سے واقف نہیں ہوں۔" سرخاب غوری نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ کبھی آپ نے پرواز کے دوران ایسی کوئی جگہ دیکھی ہو۔ اس صُورت میں آپ غور کر لیں۔ ہم کل کسی وقت فون پر آپ سے معلوم کر لیں گے۔"

"بہت بہتر۔ میں ضرور غور کروں گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

تین گھنٹے بعد انھیں نگرانی کرنے والوں کی طرف سے اِطلاع ملی کہ فیاض منیر کو گھر سے نِکل کر زرد رنگ کی کار میں شمالی سمت میں جاتے دیکھا گیا ہے۔ انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا:

"ٹھیک ہے، تم سائے کی طرح اس کے پیچھے لگے رہو۔ اور وائرلیس پر رابطہ قائم رکھو۔"

"او کے سر۔"

"ہم بھی شمالی سڑک پر آ رہے ہیں۔" انھوں نے کہا اور اپنی گاڑی کا رُخ شمالی سڑک کی طرف کر دیا۔

"شاید فیاض منیر پر خوف سوار ہو گیا ہے۔ ورنہ وُہ گھر سے ہرگز نہ نِکلتا۔ اور اب اس سے غلطی ضرور ہو گی،

اگر ہم نے اس کی غلطی سے فائدہ نہ اُٹھایا تو شاید ہم جہاز کا سُراغ نہ پا سکیں، کیوں کہ یہ منصوبہ بہت ہی سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہے۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"واقعی اتنے بڑے جہاز کو مسافروں سمیت لوگوں کی نظروں سے غائب کر دینا۔ یہ سوچا سمجھا منصوبہ نہیں تو اور کیا ہے۔"

جلد ہی وہ سادہ لباس والوں تک پہنچ گئے۔

"ہاں بھئی کیا پوزیشن ہے؟"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا رُخ شمالی پہاڑیوں کی طرف ہے۔"

"لیکن شمالی پہاڑیوں میں تو کہیں بھی جہاز اُتارنے کی جگہ نہیں۔" خان رحمان بولے۔

"یہ ضروری نہیں کہ وہ اس جگہ جا رہا ہو، جہاں جہاز ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"جمشید۔ یہ ہمیں پھانسنے کی چال بھی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ ان لوگوں نے محسوس کر لیا ہے کہ ہم لوگ جہاز مل جانے تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اوہ ہاں! ہمیں اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔" وہ بولے۔

"تب پھر کیوں نہ ہم دو پارٹیوں میں تقسیم ہو جائیں۔"

فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"اور دُوسری پارٹی ہوا میں تیر کر آگے جائے گی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"نہیں۔ پیدل چل کر۔" فرزانہ بولی۔

"تب پھر دُوسری پارٹی میں تم ہی تم ہو گی۔"

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ جس جگہ سے ہمیں خطرے کا احساس ہوگا، اس جگہ سے ہم دو پارٹیوں میں تقسیم ہو جائیں۔"

"بہت اچھی ترکیب ہے۔" خان رحمان مسکرائے۔

"شکریہ انکل۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا اور فاروق کا منہ بن گیا۔

"بھئی اس میں منہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بھی کوئی ترکیب بتا دو۔" محمود ہنسا۔

"میں کس طرح بتا دوں۔ ٹھیکا تو اس نے لے رکھا ہے۔"

"میں اپنا ٹھیکا منسوخ کرتی ہوں۔" فرزانہ نے اعلان کیا۔

"اچھا بس۔ ہم پہاڑیوں۔ ارے۔ مگر۔ وہ تو دائیں طرف مُڑ رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید زور سے چونکے۔

نیاض منیر کی زرد کار اچانک دائیں طرف مُڑ گئی

تھی۔

"ہو سکتا ہے، اسے تعاقب کا شبہ ہو گیا ہو۔"

"شبہ نہیں۔ یقین کہو۔ اس سڑک پر کوئی اور گاڑی نہ آ رہی ہے، نہ جا رہی ہے۔ تعاقب کو چھپایا جائے تو کیسے۔"

"ہوں۔ بات ٹھیک ہے۔ خیر پروا نہیں۔ اسے تعاقب کا پتا چل گیا ہے تو کیا ہوا۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ یہ جاتا کہاں ہے۔"

"اور جہاں تک میرا خیال ہے، یہ سڑک سمندر کی طرف چلی گئی ہے۔"

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔ ایک تو یہ سمندر ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

"کیا کہ رہے ہو بھئی۔ سمندر اور ہاتھ دھو کر۔" خان رحمان کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"محاورۃً انکل۔" فاروق مسکرایا۔

"اوہ اچھا۔ تب تو ٹھیک ہے۔"

سادہ لباس والوں کو انھوں نے زرد کار دیکھتے ہی واپس بھیج دیا تھا۔

یہ تعاقب قریباً دو گھنٹے تک جاری رہا، پھر سمندری

حدود شروع ہو گئیں۔ انھوں نے زرد کار کو رکتے دیکھا۔ وہ بھی رک گئے۔

"آخر اس کی منزل آ ہی گئی۔ لیکن یہاں تو دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"تیل دیکھو۔ تیل کی دھار دیکھو۔" محمود نے کہا۔

زرد کار ایک بلند و بالا چٹان کے سامنے رکی تھی، انھوں نے فیاض منیر کو چٹان کے دوسری طرف نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔

"یہاں سے ہم دو پارٹیوں میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ میں محمود اور فاروق کو لے کر آگے جا رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ محمود اور فاروق نے ان کا ساتھ دیا، لیکن جب وہ پوری احتیاط کے ساتھ چٹان کے دوسری طرف پہنچے۔ تو فیاض منیر دور دور تک نظر نہ آیا۔

"ارے۔ وہ کہاں غائب ہو گیا۔"

"شاید اسے سمندر ہڑپ کر گیا۔" فاروق بولا۔

"ہاں۔ کیوں کہ آگے تو صرف سمندر ہے۔ اور تو چھپنے کی کوئی بھی جگہ نہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"لیکن ابا جان۔ اگر اسے خود کشی کرنی تھی تو اتنی دور

آنے کی کیا ضرورت تھی؟" محمود نے اعتراض کیا۔

"میرا خیال ہے۔ میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔"

"تت۔ تب پھر؟" محمود ہکلایا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہاں کوئی لانچ وغیرہ موجود تھی۔ یا پھر آب دوز۔ وہ اس میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن ابا جان۔ ہم نے لانچ یا آب دوز کی آواز نہیں سُنی۔ چلیے ہم نے نہیں سُنی۔ فرزانہ تو سُنتی۔ اس جتنے تیز کان کیا کسی کے ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے، آب دوز بے آواز رہی ہو۔" انسپکٹر جمشید نے خیال ظاہر کیا۔

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے، وہ نکل گیا۔"

"یہی کہا جا سکتا ہے۔"

"تب پھر دوسری پارٹی کو یہاں بُلا لینے میں کیا حرج ہے۔" محمود نے کہا۔

"اب ہم ہی یہاں رُک کر کیا کریں گے۔" فاروق نے کہا۔

"رُکنا تو خیر پڑے گا۔ وہ اپنی زرد کار بھی تو یہاں

چھوڑ گیا ہے۔ کیا خبر اس کے جلد واپس آنے کا پروگرام ہو۔"

انھوں نے خان رحمان کو آواز دی۔ وہ تینوں بھی ان کے پاس چلے آئے۔

"وہ تو نکل گیا بھئی۔"

"یہی مجھے ڈر تھا۔" خان رحمان بولے۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ آؤ ذرا اس کی کار کا جائزہ لے لیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ زرد کار کی طرف بڑھے۔ اس کے دروازے کھول کر وہ اندر کی چیزوں کا جائزہ لینے لگے۔ اچانک فرزانہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"اس۔ اس کار سے دُور ہٹ جائیے۔ سب دُور ہٹ جائیں۔ فوراً۔"

یہ کہتے ہی فرزانہ نے دوڑ لگا دی۔ وہ بھی خوف زدہ ہو کر بھاگے اور دوڑتے چلے گئے۔ انھوں نے پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آخر بہت دُور جا کر رُکے۔

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ بلاوجہ ہماری دوڑ لگوا دی۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"چلو۔ ذرا ورزش ہو گئی۔" فرزانہ مسکرائی۔

"کیا تمہیں کسی بم کی موجودگی کا احساس ہوا تھا فرزانہ؟"

پروفیسر داؤد بولے۔

"ہاں انکل۔"

"تب ۔ تمہارا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا ۔ اس کار۔۔" ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے ۔ کار ایک ہولناک دھماکے سے اڑ گئی تھی ۔

اخباری خبر

چند لمحے تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتے رہے ، آخر خان رحمان بولے :

"اس کا مطلب ہے ۔ اس کو تعاقب کا علم ہو گیا تھا۔"

"لیکن وہ بم ساتھ لے کر چلا تھا۔" فرزانہ بولی ۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" محمود بولا۔

"یہ کہ اس ۔ اس کو اپنی نگرانی کا علم گھر میں ہی ہو گیا تھا۔"

"اوہ ہاں ۔ اسی لیے تو وہ بم لے کر چلا تھا۔"

"اوہو ۔ ابا جان ۔ ادھر دیکھیے ۔ وہ ۔" فاروق نے چلا کر کہا ۔ اس کی انگلی دور سمندر میں اشارہ کر رہی تھی ۔ ان کی نظریں اس سمت میں اٹھ گئیں ۔ اور جم کر رہ گئیں ۔

اس طرف سے ایک لانچ چلی آ رہی تھی ۔

"تت ۔ تو کیا ۔ فیاض ہنیر واپس آ رہا ہے۔" خان رحمان

بڑبڑائے۔

"ہاں! اس نے سوچا ہو گا۔ ہمارے تو پرخچے اڑ گئے ہوں گے۔ لہٰذا اب شہر واپس جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور ہماری گاڑی اس کے کام آ سکتی تھی۔" فرزانہ بولی۔

"ضرور یہی بات ہے۔ خیر۔ ہم اس کا استقبال کریں گے۔ اور وہ یقیناً دھک سے رہ جائے گا۔"

"بلکہ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔" فاروق مسکرایا۔

لانچ نزدیک آتی چلی گئی۔ اب وہ چٹان کی اوٹ میں ہو گئی۔ ان کے آس پاس کار کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ لانچ نزدیک آتی گئی۔ وہ ایک بہت بڑی لانچ تھی۔ اور شاید آب دوز بھی تھی، کیوں کہ جب فیاض منیر اس پر بیٹھ کر فرار ہوا تھا، اس وقت وہ انھیں نظر نہیں آئی تھی۔ اور اتنی جلدی لانچ اس قدر فاصلے پر نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اور پھر لانچ ساحل پر آ کر رک گئی۔ اس کا انجن بدستور چلتا رہا، لیکن لانچ پر انھیں کوئی نظر نہ آیا۔ انجن روم خالی پڑا تھا۔

"فیاض منیر تو اس پر نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"تت۔ تو کیا۔ وہ سمندر میں کود گیا۔" محمود بولا۔

"کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے ایسا کیا ہو۔" فرزانہ نے کہا۔

انسپکٹر جمشید بے خیالی میں آگے بڑھے۔ اور پھر لانچ پر سوار ہو گئے۔ انھوں نے انجن بند کر دیا اور بولے:

"فرزانہ۔ فوراً لانچ پر آ کر اپنے کانوں سے اس کا جائزہ لو۔ کہیں اس پر بھی تو کوئی بم نہیں ہے۔"

"جی بہتر!" اس نے کہا اور لانچ کی طرف دوڑی۔

لانچ پر سوار ہو کر اس نے کان لگا دیے۔

"جی نہیں! کوئی آواز نہیں آ رہی۔"

"ہوں! اس کا مطلب ہے، ہم لانچ پر سفر کر سکتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ لانچ واپس کس طرح آ گئی۔" خان رحمان بولے۔

"میں سازش کی بو سونگھ رہا ہوں۔ فیاض منیر سمندر میں خاص جگہ پہنچ گیا ہے، لیکن اب وہ چاہتا ہے کہ ہم بھی اس پر سوار ہو کر اس خاص جگہ پہنچ جائیں اور اس کا اور اس کے ساتھیوں کا نشانہ بن جائیں۔" انسپکٹر جمشید نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"اوہ! مطلب یہ کہ آسانی سے موت کا لقمہ بن جائیں اور وہ چین کی بانسری بجائیں۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"ہاں! تم یہ بھی کہہ سکتے ہو۔ بلکہ دو چار اور محاورات بھی چاہو تو جملے میں گھسیڑ سکتے ہو۔" محمود نے جل کر کہا۔

"شکریہ! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"جہاز کا سراغ لگانا ہے تو ہمیں اس لانچ پر سفر کرنا ہی ہوگا۔" انسپکٹر جمشید نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"چاہے سمندر میں ہمارے لیے موت کا سامان مکمل کیا جا چکا ہو۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ہاں! بالکل۔"

"تو پھر بسم اللہ۔ وطن کے لیے ہم سب کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

وہ لانچ پر سوار ہو گئے۔ انھوں نے اس کا رخ اسی سمت میں کر دیا جس سمت سے وہ آئی تھی۔ خان رحمان نے اس کا سٹیرنگ سنبھالا، کیوں کہ انھیں اس قسم کی لانچوں کا تجربہ تھا۔ کچھ دیر تک لانچ تیز رفتاری سے سفر کرتی رہی، پھر خان رحمان کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

"جمشید۔ ایک عجیب بات۔"

"میں جانتا ہوں۔ وہ عجیب بات کیا ہو گی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہرگز نہیں جمشید۔ تم بھلا کس طرح جان سکتے ہو۔" خان رحمان نے انکار میں سر ہلایا۔

"کیوں۔ کیوں نہیں جان سکتا۔"

"میرا یہی خیال ہے۔ اچھا خیر۔ بتاؤ۔" وہ بولے۔

"لانچ صرف ایک سمت میں جا رہی ہے۔ دائیں یا بائیں موڑنے پر بھی نہیں مڑ رہی ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

"ہاں! یہ شاید ریموٹ کنٹرول ہے۔ سٹیرنگ کے ماتحت نہیں ہے۔ اسی لیے ساحل سے اس کا رخ سمندر کی طرف کرتے ہوئے سٹیرنگ بغیر طاقت کے مڑتا چلا گیا تھا۔" وہ بولے۔

"اس بات کا اندازہ میں نے اسی وقت لگا لیا تھا، جب یہ خالی ساحل پر آکر رکی تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور اسی بات سے آپ نے سازش کا اندازہ لگایا ہو گا۔" محمود بولا۔

"ہاں! اس صورت میں بھلا سازش کی بو کیوں نہ محسوس ہوتی۔"

"تب پھر۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ ہم کچھ مددگار دوں

کو ساتھ لے لیتے۔"

" اس طرح وہ لوگ ہوشیار ہو جاتے اور شاید پھر ہم ان تک نہ پہنچ پاتے۔ جب کہ اب ہم سیدھے ان تک پہنچیں گے۔ دوسری بات یہ کہ فیاض منیر واقعی کسی آب دوز کے ذریعے ساحل سے سمندر میں کسی خاص جگہ تک گیا ہے۔ اور یہ لانچ صرف ہمارے لیے بھیجی گئی ہے۔"

" تو کیا ابا جان اسی کو کہتے ہیں، آ بیل مجھے مار۔" فاروق نے معصومانہ انداز میں کہا۔

" ہاں! اس کو بھی کہہ سکتے ہیں۔" وہ مسکرائے۔

" اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم بیلوں کے نرغے میں جا رہے ہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

" ایک بات ہے جمشید۔ یہ تینوں ہر قسم کے حالات میں اپنے حوصلے بلند رکھتے ہیں۔ میں نے انھیں کبھی بھی حوصلہ ہارتے نہیں دیکھا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

" انسان کی پہلی شکست حوصلہ ہارنے کے ساتھ ہی ہو جاتی ہے پروفیسر صاحب۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

" ہاں۔ بالکل۔"

لانچ پر سفر پانچ گھنٹے تک جاری رہا، پھر انھیں ایک جزیرہ دکھائی دینے لگا۔ ایک بڑا جزیرہ۔

" کیا یہ جزیرہ ہمارے ملک کی سمندری حدود میں ہے؟" خان رحمان بڑبڑائے۔

" جس رفتار سے لانچ نے سفر کیا ہے۔ اس رفتار سے اتنا وقت گزر جانے پر ہمارے ملک کی سمندری حدود ہرگز نہیں رہ سکتیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی اور ملک کی سمندری حدود میں موجود ہیں۔"

" اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

" کیا ہمیں مقابلے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔" محمود پُر جوش انداز میں بولا۔

" نہیں بھئی۔ پہلے ہم تیل دیکھیں گے اور تیل کی دھار دیکھیں گے، اس کے بعد کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کریں گے۔ ہم نہیں جانتے۔ یہاں کیا حالات ہیں۔ اور جانے بوجھے بغیر مقابلہ شروع کر دینا خطرناک نتیجہ لائے گا۔"

" بالکل ٹھیک جمشید۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا۔" خان رحمان مسکرائے۔

لانچ جزیرے کے ساحل پر رک گئی۔ وہ خود بخود رکی تھی۔ خان رحمان بھی اس کے سٹیرنگ سے پہلے ہی ہاتھ اٹھا چکے تھے، جب انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ ریموٹ کنٹرول ہے، انھوں نے دیکھا۔ جزیرے کے چاروں طرف

مشین گنیں نصب تھیں اور ان پر نقاب پوش چوکس بیٹھے تھے، کئی گنوں کے رُخ ان کی طرف تھے۔

"اب ساری بات سمجھ میں آ گئی۔" انسپکٹر جمشید نے قدرے حیرت بھری آواز میں کہا۔

"جی ساری بات۔ کیا مطلب؟"

"تم لوگ اپنے ہتھیار سمندر میں پھینک دو۔" اس وقت جزیرے سے ایک آواز اُبھری۔

وہ چونک اُٹھے، پھر انسپکٹر جمشید کے اشارے پر انھوں نے پستول پانی میں اُچھال دیے۔

"شکریہ! اطمینان کر لو۔ کہ تمھارے پاس کوئی ہتھیار رہ تو نہیں گیا۔" آواز آئی۔

"ہمارے پاس کوئی پستول نہیں رہ گیا۔" انسپکٹر جمشید نے کچھ سوچ کر فوراً کہا۔

"میں صرف پستول کی بات نہیں کر رہا۔ اگر کوئی اور ہتھیار پاس ہے تو اس کو بھی اچھال دو۔ مثلاً کوئی خنجر، کوئی چاقو۔ یا کوئی اور چیز۔"

انھوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا، پھر انسپکٹر جمشید بولے:

"محمود! اپنا چاقو بھی پھینک دو۔"

"یہ کیا کیا جمشید۔ ان کو کیا معلوم تھا چاقو کے بارے میں۔"

"ہاں! ہو سکتا ہے۔ انھیں اس کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ لیکن اس کے بعد یہ ضرور پوچھتے کہ کوئی چاقو وغیرہ کسی کے پاس رہ تو نہیں گیا۔ پھر ہمارا کیا جواب ہوتا۔ جھوٹ تو ہم بول نہیں سکتے تھے۔"

محمود نے مسکراتے ہوئے چاقو نکالا اور اُچھال دیا۔

"شکریہ۔ اب تم لوگوں کے پاس کسی قسم کا ہتھیار رہ تو نہیں گیا؟" پوچھا گیا۔

"نہیں!" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہم جانتے ہیں۔ تم لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔ اس لیے ہم تلاشی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اب تم لوگ لانچ سے اُتر کر آواز کی سمت میں چلے آؤ۔ تم لوگوں کو اس وقت تک کچھ نہیں کہا جائے گا جب تک کہ تمھاری طرف سے کوئی شرارت نہیں ہو جاتی۔ یقین رکھو۔ ہمیں تمھاری زندگی عزیز ہے۔ موت کی نسبت۔"

"بھئی واہ۔ بڑے مہربان دشمن ہیں آپ۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔"

وہ لانچ سے اُترے اور جزیرے میں بڑھنے لگے —
اب انھیں کسی قدر بے چینی محسوس ہو رہی تھی، کیوں کہ یہاں کے انتظامات معمولی نہیں تھے — اور پھر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں — وہ جزیرہ جزیرہ کم — ایئرپورٹ زیادہ تھا — ایک باقاعدہ ایئرپورٹ — جس پر بہت کشادہ اور جدید انداز کی سڑکیں بنائی گئی تھیں —

"اُف مالک — تو ہمارا جہاز اس جزیرے پر اتارا گیا ہے۔" خان رحمان کانپ اُٹھے۔

"لل — لیکن انکل — تلاش کرنے والے ہیلی کاپٹروں کو یہ کیوں نظر نہیں آیا — کیا ہیلی کاپٹروں نے ان اطراف میں جہاز کو تلاش نہیں کیا ہوگا؟"

"تلاش کرتے ہوئے تو خیر وہ اس طرف ضرور آئے ہوں گے، لیکن ان لوگوں نے اس کا بھی کوئی انتظام کر رکھا ہوگا۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہاں خان رحمان — تم ٹھیک کہتے ہو — یہی بات ہے، تم ان درختوں کو نہیں دیکھ رہے — یہ کس قدر بلند ہیں، ان کے اوپر والے سروں کو اگر ملا دیا جائے تو ایک ایسا قدرتی سائبان بن سکتا ہے کہ اس کے نیچے ایک جہاز تو کیا — کئی جہاز چھپائے جا سکتے ہیں۔"

"اوہ — اوہ — کس قدر مکمل سازش۔" پروفیسر داؤد نے ہکلا کر کہا۔

"اس سازش کو ترتیب دینے والے ضرور بہت ہوشیار لوگ ہیں۔" خان رحمان بولے۔

"آج مجھے ایک اخباری خبر یاد آ رہی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"اخباری خبر — کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"بتاؤں گا وقت آنے پر۔"

"ابھی آپ نے یہ بھی کہا تھا — کہ اب ساری بات سمجھ میں آ گئی — کیا آپ وہ ساری بات بھی ہمیں نہیں بتائیں گے۔"

"ضرور بتاؤں گا — لیکن کچھ دیر بعد — اس طرح مزا نہیں آئے گا۔"

"آپ کو اس طرح مزا نہیں آئے گا اور ہمیں جو بے چینی محسوس ہو رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں — فکر نہ کرو۔" انھوں نے کہا۔

وہ آگے بڑھتے چلے گئے — جزیرے کو دیکھ دیکھ کر وہ حیران ہوتے جا رہے تھے — یہاں ایک وقت میں ایک نہیں کئی جہاز چھپائے جا سکتے تھے — اور فضا سے جہاز کو آسانی سے

اتارا بھی جا سکتا تھا۔

"حیرت ہے۔ اگر جہاز یہاں اُتارا گیا ہے تو پھر راجا آباد کے ایر پورٹ پر وُہ پلاسٹک بیگ کیوں پڑا ہوا ملا تھا۔" فارُوق بڑبڑایا۔

"اس کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ جان بوجھ کر پھینکا گیا تھا۔ تاکہ ہم غلط راستوں پر بھٹکتے رہیں۔ راجا آباد کی سڑک پر ہمارا راستا بھی اسی خیال سے روکا گیا تھا تاکہ ہم یہی سمجھتے رہیں کہ جہاز کو راجا آباد کے ایر پورٹ پر ہی اتارا گیا ہے۔ اس طرح ہم ساری عُمر بھٹکتے رہتے، لیکن جہاز کا سُراغ نہ پا سکتے۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہم نے تفتیش کا ایک دُوسرا رُخ اختیار کیا اور اس رُخ سے ہم فیاض منیر تک جا پہنچے۔ پھر سوالات کرکے ہم نے اس کے سکون کو تباہ کر دیا اور وُہ گھر سے نکلنے پر مجبور ہو گیا، لیکن گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے ان لوگوں سے مشورہ کیا تھا اور اس مشورے میں یہ طے پایا تھا کہ ہم لوگ تعاقب کریں تو تعاقب کرنے دیا جائے۔ اس طرح دراصل انھوں نے ہم سے بہت خوب صُورتی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔" یہاں تک کہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"بس یہ آخری بات آپ کی ٹھیک نہیں ہے انسپکٹر جمشید۔" آواز آئی۔

"کیا مطلب؟"

"ہم آپ سے چھٹکارا حاصل نہیں کریں گے۔ بلکہ آپ کو زندہ سلامت رکھیں گے۔ آپ لوگ ہمارے لیے زندہ حالت میں زیادہ مفید ہیں۔"

"اوہ! ہم سمجھ گئے۔ گویا تم لوگ ہمارے بدلے میں بھی کروڑوں روپے حاصل کرو گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ اب آپ لوگ چلے آئیں۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

وُہ چلتے رہے۔ آخر انھوں نے درختوں کے سائبان دیکھے، درختوں کی چوٹیوں کو آپس میں ملا دیا گیا تھا۔ ان حالات میں اوپر سے گزرنے والے ہیلی کاپٹر اور جہاز نیچے کھڑے جہاز کو کسی طرح بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اب سڑک کے دونوں طرف مسلح پہرے دار کھڑے نظر آنے لگے۔ وُہ بالکل چوکس کھڑے تھے۔ آخر انھیں جہاز نظر آگیا۔ جہاز کو چاروں طرف سے گھیرے میں لیا گیا تھا، اور گھیرے میں لینے والے جہاز سے بہت فاصلے پر تھے، انھوں نے دُور سے ہی دیکھ لیا۔ مسافر جہاز کے اندر

ہی تھے۔ شاید انہیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

" آپ لوگ سیدھے جہاز میں چلے جائیں۔ اب آپ کو بھی ان سب کے ساتھ جہاز میں ہی رہنا ہوگا۔ آپ کے لیے باورچی خانے میں سیٹیں لگا دی گئی ہیں۔"

" بھئی واہ۔ پھر تو مزا رہے گا۔ کم از کم بھوک تو نہیں ستائے گی۔" پروفیسر داؤد خوش ہو کر بولے۔

" نگرانی کرنے والوں سے جہاز اتنی دُور ہے کہ کوئی شرارت اور کوئی چال کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا آپ لوگ کسی قسم کی بھی کوئی کوشش نہیں کریں گے۔ ورنہ ہم یہ بات بھول جائیں گے کہ آپ ہمارے لیے زندہ حالت میں زیادہ فائدہ مند ہیں۔"

" شکریہ۔ ہم یہ بات یاد رکھیں گے۔" فارُوق نے منہ بنا کر کہا۔

" رات کو جہاز کے دروازے بند رکھے جائیں گے۔ کسی نے بھی کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ فوراً اس کی طرف ایک گولی آئے گی۔ ہم لوگ پہرے دار بدلتے رہیں گے۔ کسی پہرے دار کے قریب نیند پھٹکے گی بھی نہیں۔" آواز آئی۔

" بس کرو۔ اب ہمیں اور نہ ڈراؤ۔ یہ بتاؤ۔ تم لوگ سامنے

کیوں نہیں آئے۔ کہاں چھپے بیٹھے ہو؟

" ہمارا چھپ کر بیٹھ رہنا ہی تم لوگوں کے لیے مفید ہے۔" کہا گیا۔

" ہم لوگوں کے لیے یا تم لوگوں کے لیے۔ شاید تم لوگ ڈرتے ہو کہ اگر ہم نے تم لوگوں کو دیکھ لیا تو کہیں ہم کوئی چال چلنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

" ہمیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ڈرنے کے دن اب تم لوگوں کے ہیں۔" کہا گیا۔

" ہاں۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں۔ تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے۔" انسپکٹر جمشید زہریلی ہنسی ہنسے۔

" اگر جانتے ہیں تو بھی خاموش رہنا بہتر ہوگا۔" دُوسری طرف سے جواب دیا گیا۔

" ہاں! میں اس بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔" وُہ بولے۔

اب ان کا رُخ جہاز کی طرف ہو گیا۔ کھڑکیوں میں سے جتنے لوگ بھی ان کی طرف دیکھ سکتے تھے، دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ دونوں دروازوں میں کھڑے انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید وُہ سب کے سب ان کی آمد پر

حیران تھے - کہ یہ کون لوگ ہیں جو جہاز پر سوار نہیں تھے ، مگر جہاز کے قیدی بنائے جا رہے ہیں ـــ

آخر وہ جہاز کی سیڑھی تک پہنچ گئے اور اوپر چڑھنے لگے - اور پھر ایک آواز اُبھری :

" ارے ! یہ تو انسپکٹر جمشید ہیں "

دھت تیرے کی

" اوہ ! " بہت سی آوازیں اُبھریں -

وہ سب سے اُوپر والی سیڑھی پر پہنچ گئے - لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور بُری طرح گھیرے میں لے لیا :

" آپ لوگ یہاں کیسے پہنچ گئے جناب - شہر میں کیا حالات ہیں - ہمارے گھروں میں کیا حال ہے - آخر ہمیں کیوں اغوا کیا گیا ہے ، اغوا کرنے والے کیا چاہتے ہیں - یہ ہمیں کب رہا کریں گے ، ہم کب اپنے گھروں کو جا سکیں گے ـــ اپنے بال بچوں کو کب دیکھ سکیں گے ؟"

چند سیکنڈ کے اندر اَن گنت سوالات ان سے کر ڈالے گئے - انسپکٹر جمشید نے پریشان ہو کر ہاتھ اوپر اُٹھا دیا اور بلند آواز میں بولے :

" اگر آپ سب لوگ خاموش ہو جائیں تو میں خود ہی ان تمام سوالات کے جوابات دے ڈالوں گا جو آپ کے

ذہنوں میں طوفان کی طرح مچل رہے ہیں ۔ اور اگر آپ
لوگ تابڑ توڑ انداز میں سوالات جاری رکھیں گے تو شاید
میں ایک سوال کا جواب بھی نہیں دے پاؤں گا ۔ اس
طرح الجھن اور بڑھ جائے گی ۔ آپ تو سب اعلیٰ تعلیم یافتہ
ہیں ۔ اور اسلام کا نام بلند کرنے کے لیے گھروں سے روانہ
ہوئے ہیں ۔"

" ہاں ! یہ ٹھیک ہے ۔" کسی نے جلدی سے کہا ۔

" ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہے ۔ ہم کوئی سوال نہیں کریں گے ۔
آپ ہمیں خود ہی بتائیں ۔ جو کچھ بھی بتا سکتے ہیں ۔"

ایک لمحے کے لیے مکمل خاموشی طاری ہو گئی ۔ وہ سب
بری طرح بے چین نظر آ رہے تھے ۔ سب ان پر ٹوٹے پڑ
رہے تھے ۔ ایسے میں انھیں ایک اور بات کا احساس ہوا ؛
چنانچہ انسپکٹر جمشید بولے :

" جہاز کے عملے کا کوئی آدمی یہاں نظر نہیں آ رہا ۔"

" ان میں سے تو ایک کو بھی یہاں نہیں رہنا دیا گیا ۔"

" پہلے آپ میں سے کوئی بتائے ۔ جہاز کس طرح اغوا
کیا گیا تھا ۔ کیا کسی نے جہاز کے کپتانوں پر پستول وغیرہ
تان لیا تھا ؟"

" ہاں ! ایسا ہی ہوا تھا ۔ آپ اپنی سنائیے ۔"

انھوں نے محسوس کیا ۔ وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہیں ،
صرف سننا چاہتے ہیں ۔ آخر انھوں نے شہر کے تمام حالات
سنا دیے ۔ اور ان لوگوں کا مطالبہ بھی انھیں سنا دیا ۔

" اوہ ۔ تو ایک ایک کروڑ روپے کا مطالبہ کیا ہے ان لوگوں
نے ، حیرت ہے ۔"

" ہاں ! اور یہ مطالبہ آخری مطالبہ ثابت نہیں ہوگا ۔
مطالبہ پورا ہونے کے بعد ۔" وہ کہتے کہتے رک گئے ۔ وہ جو جملہ
کہنے والے تھے ۔ اس سے وہ اور خوف زدہ ہو جاتے ۔ اس
لیے انھوں نے فوراً جملہ بدل دیا :

" مطالبہ پورا ہونے کے بعد بھی وہ کچھ اور رقم اینٹھنے کی
کوشش کریں گے ۔ اس کے بعد کہیں جا کر ہم لوگوں کو رہا
کیا جائے گا ۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا ، حالاں کہ وہ
جانتے تھے ۔ اغوا کرنے والوں کا انھیں رہا کرنے کا کوئی
پروگرام نہیں تھا ۔ وہ تو ان کے مرتے دم تک بس رقمیں
حاصل کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے ۔

" اُف مالک ۔ یہ ہم کس مصیبت میں مبتلا ہو گئے ۔
ارے مگر ۔ آپ لوگ کس طرح پھنس گئے ؟" کسی نے کہا ۔

اب انھیں اپنی تفتیش کی کہانی سنانا پڑی ۔

" اب کیا ہوگا ۔ ہمیں رہائی کب نصیب ہو گی ۔ نہ جانے

کب ان لوگوں کے مطالبات پورے ہوں گے۔"

" صرف اور صرف ایک ہی طریقہ ہے رہا ہونے کا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" اور وہ کیا؟" سب کے سب بول اُٹھے۔

" اور شاید اب تک اس طریقے پر عمل نہیں کیا گیا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

" اور وہ کیا طریقہ ہے؟"

" اللہ سے مدد مانگیے۔ ان حالات میں اس کے سوا کون ہے۔ جو ہمیں یہاں سے رہائی دلائے گا۔ اس کے آگے جھک جائیے۔ گڑگڑائیے۔ گناہوں کی معافی مانگیے۔"

" اوہ۔ اوہ۔ واقعی۔ ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ ہمیں یہی کرنا ہوگا۔" بہت سی آوازیں اُبھریں۔

" تو پھر ہمیں ذرا باورچی خانے تک جانے دیں۔ بہت زیادہ تھک گئے ہیں ہم۔ ذرا دیر آرام کریں گے، لیکن آرام کے دوران بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے رہیں گے۔"

ان کا راستا چھوڑ دیا گیا۔ وُہ باورچی خانے میں آ گئے۔ انھوں نے دروازہ بند کر لیا اور ایک دُوسرے کی طرف دیکھا۔

" لو بھئی۔ اب کچھ دیر آرام کر لو۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

سب نے ان کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔ انھوں نے فوراً اُنگلی ہونٹوں پر رکھ کر اشارہ کیا اور اشارے میں بولے:

" بھئی۔ جہاز پر ہونے والی گفت گو وُہ لوگ سُن رہے ہوں گے۔ ہم یہی ظاہر کریں گے کہ ہم آرام کر رہے ہیں۔"

اب انھوں نے قلم اور کاغذ سنبھال لیے۔ اور لکھ لکھ کر بات چیت کرنے لگے۔

" ہاں! ان حالات ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

" ہمیں کسی نہ کسی طرح جہاز سے نکل کر باہر جانا ہوگا۔ اور رات کے وقت ان لوگوں سے ٹکرانا ہوگا، اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔" خان رحمان نے لکھا۔

" میرا بھی یہی خیال ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم جہاز سے باہر کس طرح جائیں۔ جہاز کو چاروں طرف سے بغور دیکھا جا رہا ہے۔"

" ہاں! ہم دروازے کے راستے باہر نہیں نکل سکتے، ہمیں تو کسی اور ذریعے سے نکلنا ہوگا۔ اس طرح کہ وُہ لوگ ہمیں دیکھ بھی نہ سکیں۔ اور ہم ان پر ٹوٹ پڑیں۔"

" یہ کام اتنا آسان نہیں۔ زندگی اور موت کا کھیل

ہے۔" محمود نے لکھا۔

"بلکہ زندگی کا کم اور موت کا زیادہ ہے۔" فاروق نے لکھا۔

"کچھ بھی ہو۔ ہمیں یہ کام کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ لوگ ہم میں سے ایک کو بھی اپنے ملک میں نہیں جانے دیں گے۔ ہمارے گھر والوں کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر کے بھی ہمیں نہیں جانے دیں گے۔"

"تب پھر کیا کیا جائے؟"

"فرزانہ۔ تم کوئی ترکیب بتاؤ۔"

"میں سوچنے کی مہلت چاہتی ہوں۔"

"ضرور۔ تمھیں مہلت دی جائے گی۔ اس دوران ہم سب بھی غور کریں گے۔"

وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ سوچ کے دوران انھوں نے باورچی خانے کا بھی جائزہ لیا، آخر فرزانہ نے لکھا:

"ہم اس وقت باورچی خانے میں ہیں، باورچی خانے میں ہمارے پاس جو چیزیں موجود ہیں، اگر ہم ان کی مدد سے باورچی خانے کے فرش میں ایک آدمی کے برابر خلا بنا لیں تو ہم نیچے اتر سکتے ہیں۔ ایک بار ہم ان کی نظروں سے بچ کر نیچے اتر جائیں، پھر ہم ان سے

نبٹ لیں گے۔"

"لیکن فرزانہ۔ معاملہ صرف باورچی خانے کے فرش کا ہی نہیں ہے۔ اس سے نیچے سامان کا خانہ ہوگا۔ جس میں مسافروں کا سامان بھرا ہوا ہوگا۔ ہمیں سامان ہٹا کر وہاں بھی سوراخ کرنا پڑے گا۔" محمود نے لکھا۔

"چلو۔ یوں ہی سہی۔ جس طرح ہم باورچی خانے کے فرش میں راستا بنائیں گے، اسی طرح اس جگہ بنا لیں گے۔ سوال تو یہ ہے کہ یہاں سوراخ کیسے کیا جائے؟ ہمارے پاس باورچی خانے میں گیس کا سلنڈر موجود ہے، اگر ہم سلنڈر کا پائپ الگ کر کے اس کے شعلے کی مدد سے تھوڑے سے حصے کو جلائیں تو کیا خیال ہے۔"

"میرا خیال ہے۔ ترکیب قابلِ عمل ہے۔" انسپکٹر جمشید نے لکھا۔

"اس کا مطلب ہے۔ فرزانہ ترکیب بتانے میں پھر بازی لے گئی۔" پروفیسر داؤد نے مسکراتے ہوئے لکھا۔

اور پھر پہلے انھوں نے رات ہونے کا انتظار کیا۔ اس کے بعد اپنی ترکیب پر عمل شروع کیا۔ باورچی خانے میں سے انھیں چمچے اور کانٹے وغیرہ بھی مل گئے۔ جن کی مدد سے انھوں نے فرش کو اکھاڑنے کی کوشش جاری

رکھی، لیکن جب کام نہ بنا تو پھر لائٹر کی مدد سے گیس
کے پائپ کو آگ دکھانا پڑی۔ انسپکٹر جمشید نے پائپ کے
سرے پر لوہے کی ایک باریک نلکی سی لگا دی۔ گیس
اب ایک باریک شعلے کی صورت میں نکل رہی تھی۔ اس
شعلے کی مدد سے انھوں نے فرش پر کام شروع کر
دیا۔ فرش میں پہلے ایک سوراخ ہوا۔ پھر دوسرا۔
اس طرح سوراخ بنتے چلے گئے، پھر سوراخ آپس میں مل
کر بڑے ہونے لگے۔ اور آخر ایک آدمی کے برابر خلا
بن ہی گیا۔ اب انھوں نے گیس بند کر دی۔ اور
نیچے دیکھا۔ وہاں واقعی سامان بھرا پڑا تھا۔ اب
انسپکٹر جمشید نیچے لٹک گئے۔ انھوں نے بھی لٹکنے میں
دیر نہیں کی۔ سامان کو ایک طرف ہٹایا گیا۔ اب
پائپ کو نیچے تک لانا پڑا۔ پائپ اتنا لمبا ثابت نہیں
ہوا۔ لہٰذا سلنڈر کو خلا کے منہ پر جھکا دیا گیا۔
اس طرح پائپ نیچے تک پہنچا۔ انھوں نے پھر پہلے
والا عمل شروع کیا۔ آخر سوراخ بننے لگے اور پھر ایک
آدمی کے برابر خلا بن گیا۔ گیس بند کر دی گئی۔
اب انسپکٹر جمشید نے صرف سر باہر نکال کر چاروں طرف
کا جائزہ لیا۔ جہاز پر چاروں طرف سے سرچ لائٹوں

کی روشنیاں پڑ رہی تھیں، لیکن جہاز کے بالکل نیچے کچھ
جگہ لائٹوں سے محفوظ بھی تھی۔
"یہی جگہ ہے۔ ہمارے اترنے کی۔" انسپکٹر جمشید نے سرگوشی
کی۔
"اور ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔" خان رحمان
بولے۔
"ہم میں سے ہر ایک کو اللہ نے دو دو ہاتھ دے
رکھے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
"تو پھر بسم اللہ کریں۔ اللہ مالک ہے۔" فرزانہ نے کہا۔
انسپکٹر جمشید نے پہلے ٹانگیں خلا میں سے نیچے نکالیں
پھر دھڑ۔ اس کے بعد بازوؤں کے سہارے نیچے لٹک گئے،
لیکن ان کے پیروں سے زمین کافی نیچے تھی۔ اب سوال یہ
تھا کہ ان کے گرنے سے جو آواز پیدا ہو گی، وہ دشمنوں
کے کانوں تک پہنچے گی یا نہیں۔
"کیا سوچنے لگے بھئی۔" خان رحمان بے چین ہو کر بولے۔
"مجھے کودنا پڑے گا۔ اور اس طرح آواز پیدا ہو گی۔"
"پنجوں کے بل زمین پر گرو گے تو آواز بہت ہی
معمولی سی پیدا ہو گی۔ جو اتنی دور تک نہیں جا سکے گی۔"
خان رحمان نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔" انھوں نے کہا اور ہاتھ چھوڑ دیے۔

اُن کے پنجے نیچے لگے۔ امید کے مطابق بہت ہی ہلکی آواز پیدا ہوئی۔ اب خان رحمان لٹکے۔ انھیں انسپکٹر جمشید نے ٹانگوں سے پکڑ لیا۔ اس لیے انھیں کودنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اس طرح وہ ایک ایک کر کے اُتر گئے، اب انھوں نے ایک بار پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ وہ اس تاریک جگہ پر دبکے ہوئے تھے۔ چاروں طرف دشمن موجود تھے اور پوری طرح چوکنے بھی تھے۔

"کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی۔ جس پر چل کر ہم ان تک پہنچ سکیں۔ اب کیا کیا جائے؟" انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی۔

"پھر۔ اب کیا کیا جائے؟" خان رحمان بڑبڑائے۔

"غور۔ انسان عقل سے بہت بڑے بڑے کام نکال لیتا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"تو پھر ایک بار پھر آواز دو اپنی عقل کو۔"

فرزانہ سوچ میں گم ہو گئی، پھر بولی:

"اگر ہم سامان میں سے ایک بیگ۔ یا کوئی ہلکا سوٹ کیس اُٹھا کر کسی سمت میں پھینک ماریں۔ تو کیا خیال ہے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" فاروق نے منہ بنایا۔

"کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ کم از کم ان لوگوں کے کان ضرور کھڑے ہوں گے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ جہاز پر گڑبڑ ہے یا گڑبڑ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جہاز پر آئیں گے۔ اس وقت شاید ہمیں کوئی موقع مل جائے۔ ادھر ہم باورچی خانے کا دروازہ اندر سے بند کر آئے ہیں۔ وہ صورتِ حال کو جلد نہیں سمجھ سکیں گے۔"

"شاید ان حالات میں اس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو پھر بسم اللہ کیجیے۔"

انسپکٹر جمشید خان رحمان کے کندھے پر سوار ہوئے اور پھر خلا میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے کسی ہلکے پھلکے بیگ یا سوٹ کیس کی تلاش شروع کی، لیکن سبھی چیزیں وزنی اور بڑی تھیں۔ اور ان میں کوئی بھی اس خلا میں سے نہیں گزر سکتی تھی۔ آخر انھوں نے ایک دوسری ترکیب سوچی۔ ایک بڑے بیگ کو کھول ڈالا۔ اور اس کی چیزیں اُلٹ دیں۔ ان چیزوں میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبا بھی تھا۔ شاید سگار وغیرہ رکھنے کا ڈبا تھا۔ انھوں نے ڈبا نیچے لٹکا دیا اور پھر ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ خان رحمان نے ڈبا دبوچ

لیا۔ اب انسپکٹر جمشید نیچے اُتر گئے۔ اُنھوں نے ہاتھ کو
پورے زور سے دو تین بار گردش دی اور ڈبے کو
ایک سرچ لائٹ کی طرف دے مارا۔ یہ خیال اسی
وقت ان کے ذہن میں کوندا تھا۔ کہ دشمنوں کی طرف
اچھالنے کی بجائے، کیوں نہ سرچ لائٹ پر دے مارا
جائے۔ اور ان کی یہ ترکیب کارگر رہی۔ ڈبا ٹھیک لائٹ
پر لگا۔ وہ ایک چھناکے سے ٹوٹی اور اس سمت میں اندھیرا
ہو گیا۔ یہی وقت تھا کام کا۔ انھوں نے تاریک راستے
پر پنجوں کے بل جھکے جھکے انداز میں دوڑ لگا دی۔ ادھر
یک دم ایک آواز گونجی:

"خبردار۔ تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔
سب لوگ جہاز میں رہیں۔ جہاز سے باہر جو بھی نظر آیا،
اسے گولی مار دی جائے گی۔"

صاف ظاہر ہے۔ یہ الفاظ جہاز کے مُسافروں کے
لیے کہے گئے تھے۔ ان سے نہیں۔ لہٰذا وہ دوڑتے چلے گئے
اور آن کی آن میں سرچ لائٹوں سے بھی آگے نکل گئے۔

اب وہ پلٹے۔ نگرانوں کا ایک دستہ جہاز کی طرف جا
چکا تھا۔ باقی لوگ چوکس کھڑے تھے۔ اب وہ ان چوکس
کھڑے ہوئے نگرانوں کی کمر کی طرف تھے۔ انسپکٹر جمشید

نے ان سب کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود سینے
کے بل آگے رینگنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک نگران
کے عین پیچھے پہنچ گئے۔ اچانک وہ آواز پیدا کیے بغیر
اُٹھے۔ اسی لمحے انھیں اپنے سانس سینوں میں اٹکتے محسوس
ہوئے۔ ان کی اس پہلی کامیابی پر ہی آیندہ کامیابی کا
دار و مدار تھا۔ پھر ان کے ہاتھ تیزی سے حرکت میں
آئے۔ ایک ہاتھ ان کا اس کی گردن کے پیچھے سے
اس کے منہ پر جم گیا۔ دُوسرا ہاتھ اس کی گردن کی
ہڈی پر لگا۔ یہ وار اتنا کاری تھا کہ ہڈی ٹوٹ گئی۔
لیکن دُوسرا ہاتھ چُوں کہ منہ پر تھا۔ اس لیے اس کے
منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ کچھ دیر تک انھوں نے
اس کا منہ اور ناک دبائے رکھے۔ آخر اس نے دم توڑ
دیا۔ انھوں نے اس کی گن پر قبضہ کر لیا۔ اور خان
رحمان کو اشارہ کیا کہ دُوسرے دُشمن کے قریب پہنچ
جائیں۔ اس سے پہلے کہ خان رحمان نزدیک پہنچتے، انسپکٹر
جمشید نے فائر کھول دیا۔ دُوسرا گن مین اُچھل کر دُور جا
پڑا اور خان رحمان نے اس کی گن پر قبضہ کر لیا۔ اسی
طرح ایک ایک کر کے ان سب کے حصّے میں ایک ایک
گن آ گئی۔ انھوں نے باقی ماندہ نگرانوں کو نشانے

پر دکھ لیا۔ گولیوں کی آوازیں سُن کر جہاز کی طرف
جانے والے نگرانوں کا دستہ واپس پلٹا اور اندھا دھند
ان کی طرف دوڑ پڑا۔ اور یہ ان سے بدحواسی میں ہوا،
وُہ ان کے لیے حلوہ ثابت ہوئے۔

جہاز کی دُوسری سمتوں سے نگران دوڑ دوڑ کر اس
طرف آنے لگے اور ان کا نشانہ بنتے چلے گئے۔ ذرا سی دیر
میں میدان صاف تھا۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید بلند آواز
میں بولے:

"جہاز کے قیدیو۔ آپ سب کو مُبارک ہو۔ آپ سب
فوراً باہر آ جائیں۔ اور ایک ایک گن سنبھال لیں، کیونکہ
ابھی جزیرے میں کافی دشمن موجود ہیں؛ تاہم اب ان
میں مقابلے کی ہمت نہیں رہی۔"

ان کے الفاظ منہ میں تھے کہ انھوں نے دوڑتے قدموں
کی آواز سُنی:

"اوہ۔ محمود۔ فارُوق۔ فرزانہ۔ شاید اصل لوگ لانچ کی
طرف دوڑ پڑے ہیں۔ ان کے لانچ تک جانے سے پہلے
تم پہنچ جاؤ۔ ان کی گرفتاری از حد ضروری ہے۔ ورنہ
ساری محنت ضائع ہو جائے گی اور ہم بھی شاید جزیرے
سے نہ نکل سکیں، کیوں کہ بہرحال ہم غیر مُلک کی حدود

میں ہیں۔"

ان الفاظ کے سُنتے ہی محمود، فارُوق اور فرزانہ دوڑ
پڑے۔ اب ان کے پاس صرف پستول تھے۔ جو انھوں نے
گنوں والوں کی پیٹیوں میں سے نکالے تھے۔ وُہ اس قدر
تیز دوڑے کہ کیا کبھی دوڑے ہوں گے۔ لانچ کی سمت
انھیں معلوم ہی تھی۔ آخر وُہ ساحل پر پہنچ گئے۔ لانچ کو
دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ اسی وقت انھوں نے
دوڑتے قدموں کی آواز سُنی۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ،
فائر کھول دیا۔ دوڑنے والے تڑا تڑ گرتے چلے گئے۔
ان میں سے ایک بھی دوڑنے کے قابل نہ رہا۔ تھوڑی دیر
بعد انسپکٹر جمشید بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے دشمنوں کو
لمبا لیٹے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ اور پھر لانچ پر قبضہ
کر لیا گیا۔ جزیرے پر جو لوگ بچ گئے، انھوں نے ہاتھ
اوپر اٹھا دیے۔ سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ اب ایک
سرچ لائٹ کا رُخ اس طرف کیا گیا اور دوڑنے والوں کا
جائزہ لیا گیا۔ انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مرنے والوں
میں جہاز کا کپتان کاشف غوری، نائب کپتان اختر کاشوکی
اور ایر ہوسٹس زوبی منیر بھی تھے۔ ان میں فیاض منیر بھی
تھا۔ باقی عملے کے لوگ ایک جگہ بندھے ہوئے ملے۔ گویا

وہ سازش میں شریک نہیں تھے۔

"ابا جان۔ ہم بہت بے چین ہیں۔ کچھ تو بتا دیں۔" محمود نے کہا۔

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔ اس وقت تک تمام مسافر بھی ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا:

"ہمارے پڑوس میں ایک غیر مسلم ریاست ہے۔ جو ان دنوں مالی بدحالی کا شکار ہے۔ یہ منصوبہ دراصل ایک سال پہلے اس نے بنایا تھا۔ اور یہ جزیرہ بھی اسی کی حدود میں ہے۔ مجھے اخبار کی ایک خبر یاد آگئی تھی۔ جس کی بنا پر ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ ایک سال پہلے اس ریاست نے دوستانہ انداز میں ہمارے ملک کے سب سے مشہور ریٹائرڈ پائلٹ سرخاب غوری کو دعوت دی تھی۔ اس دعوت کی وجہ اس وقت تو شاید کسی نے بھی نہ سوچی ہو گی، کیوں کہ بات بہت معمولی تھی۔ لیکن اب اصل بات سمجھ میں آئی۔ دراصل اس سازش کی تفصیلات اس وقت طے کی گئی تھیں۔ اس حکومت نے جزیرے پر ایر پورٹ بنوایا۔ اور شاید کپتان کاشف غوری نے خفیہ طور پر اس جزیرے کا

دورہ بھی کیا ہو گا۔ تاکہ جہاز کو یہاں اُتارنے میں آسانی رہے۔"

"ایک بات رہ گئی۔ فیاض منیر نے فاخر کریم کو کیوں قتل کیوں کیا تھا؟"

"ایسا معلوم ہوتا ہے، انجنیئر فاخر کریم سے ایر پورٹ بنانے کے سلسلے میں مدد لی گئی تھی۔ لہٰذا اسے ختم کرنا ضروری تھا۔ لیکن ان لوگوں کو کیا معلوم تھا کہ اس کا خون ان سب کو لے ڈوبے گا۔"

"ابا جان۔ اس کیس کا اصل اور بڑا مجرم سرخاب غوری ہے نا؟" فرزانہ بولی۔

"ہاں! اسے ہم اپنے شہر پہنچ کر گرفتار کریں گے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ ہو گا کہ پانسا اس طرح بھی پلٹ سکتا ہے۔"

"راجا آباد کے راستے میں ہمیں ختم کرانے کے لیے گمی وغیرہ کرائے کے قاتلوں کو کس نے بھیجا تھا؟"

"ظاہر ہے، انھیں بھی سرخاب غوری نے بھیجا ہو گا۔"

"لیکن سرخاب غوری کو اس سازش میں شریک ہونے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ہو سکتا ہے۔ وہ شروع سے ہی اس ملک کا جاسوس

رہا ہو۔ یا بڑی دولت کے لالچ میں آگیا ہو۔ شاید وہاں اسے کوئی بڑا عہدہ دینے کا لالچ دیا گیا ہو۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

" دھت تیرے کی۔ یہاں بھی تان لالچ پر آکر ٹوٹی۔"

محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

اور وہ مسکرانے لگے۔

اشتیاق احمد.... یہ نام اچانک میرے سامنے آیا اور میرے دل و دماغ پر کچھ اس طرح چھا گیا کہ چاروں طرف یہی نام گردش کرتا نظر آیا.... یا یوں کہہ لیں کہ ان کے ناولوں نے میرا گھیراؤ کر لیا.... اور لیبیا میں وقت انھی ناولوں کے سہارے گزرنے لگا.... اس وقت میں نے یہ بات خواب میں بھی نہیں سوچی تھی کہ ایک دن میں ذاتی طور پر اشتیاق احمد سے منسلک ہو جاؤں گا.... پاکستان آیا' ان سے ملا تو ان کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔

اشتیاق احمد بچوں کے لیے بیس سال سے لکھ رہے ہیں اور لکھتے لکھتے بڑے ہونے کی بجائے بچے ہوتے جا رہے ہیں.... مجھے ڈر ہے.... کہیں وہ اپنی آخری عمر میں چھوٹے سے بچے نہ رہ جائیں۔

اسی حوالے سے بچے انھیں پسند کرتے ہیں کہ وہ کوئی بڑے بوڑھوں کی طرح' ناولوں میں نصیحتیں نہیں کرتے نظر آتے.... ہلکے پھلکے انداز میں' مزاح کے رنگ میں' جاسوسی کے لبادے میں' مہمات کی رو میں اپنے کرداروں کے ساتھ ساتھ' قارئین کو بہا لے جاتے ہیں۔

اور یہی ان کا مخصوص انداز ہے۔

طاہر الیس ملک

ترتیب پبلشرز :- 1- میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ' اردو بازار لاہور